جلد ٥ جون ، دسمبر ١٩٦٤ نمبر ١ ، ٢

# مجلۂ علوم اسلامیہ



اڈیٹر

ڈاکٹر مختار الدین احمد

ادارۂ علوم اسلامیہ

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

# مجلس ادارت

صدر :

پروفیسر عبد العلیم

اراکین :

ڈاکٹر سید مقبول احمد

ڈاکٹر منیب الرحمن



اڈیٹر :

ڈاکٹر مختار الدین احمد

مجلۂ علوم اسلامیہ سال میں دو بار شائع ہوتا ہے

ایک شمارے کی قیمت پانچ روپیے

مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ

# مجلۂ علوم اسلامیہ

جون ، دسمبر ۱۹٦٤ م

## فہرست مضامین

مقالات :

* *
*

# عربوں کا علم المثلثات

شبیر احمد خاں غوری*

اس عنوان سے جناب پروفیسر محمد فضل الدین قریشی صاحب فیلو پنجاب یونیورسٹی لاہور کا ایک مقالہ «مجلۂ علوم اسلامیہ» جون ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا ہے. یہ مقالہ میرے مضمون «البیرونی سے پہلے علم المثلثات کا ارتقا» پر جو اسی رسالے (جون ۱۹۶۱ء) میں شائع ہوا تھا، تنقید ہے. میں قریشی صاحب کا شکر گذار ہوں کہ انہوں نے میری اس ناچیز پیش کش کو در خور اعتنا سمجھا. ان کی تنقید کے جواب کی تو چنداں ضرورت محسوس نہیں ہوتی. البتہ دو چیزوں کے متعلق اپنے موقف کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں: قریشی صاحب کا فرمانا ہے کہ میں نے مسئلے کی تاریخی جہت پر ضرورت سے زیادہ زور دیا ہے. دوسرے میں نے «چہار مقالۂ» نظامی عروضی سمرقندی کی اس حکایت کو صحیح سمجھ لیا ہے. جس میں سلطان محمود غزنوی کے بوعلی سینا اور دیگر افاضل خوارزم سے طلب کرنے کا مذکور ہے، حالانکہ زخاؤ نے اسے ساقط الاعتبار قرار دیا ہے. ذیل میں انہیں دو باتوں کے متعلق مجھے اپنے موقف کی وضاحت کرنا ہے.

علم المثلثات کے ارتقا کا تاریخی پس منظر:

قریشی صاحب کا فرمانا ہے: «ریاضی کے اس موضوع (علم المثلثات) سے قطع نظر انہوں نے یا تو عرب فضلاء کے مختصر سوانح حیات بیان کیے ہیں یا ان کا تاریخی پس منظر پیش کیا ہے... عربوں کے ہاں علوم کی جو

---

(*) شبیر احمد خاں غوری، رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش الہ آباد.

تصویر انھوں نے کھینچی ہے وہ گو رنگین و دلکش ضرور ہے لیکن اپنے اصلی خد و خال سے مبرا ہے۔ فرض یہ کہ تصویر کا ایک دھندلا سا خاکہ ناظرین کے پیش نظر ہے۔ اس خاکے کے کھینچنے میں بھی اُن سے کئی جگہ تسامح ہوا ہے»۔

(الف) میں نے مسلم علم المثلثات کے ارتقا کو اس کے تاریخی پس منظر میں پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس طرح اس کی تدریجی ترقی کا اندازہ ہوسکتا ہے، کیونکہ اس عاجز کا خیال ہے کہ انسانی کاوشیں، خواہ فکری ہوں یا عملی، خلا میں پروان نہیں چڑھا کرتیں بلکہ تاریخی عوامل ہی اُن کا رخ متعین کیا کرتے ہیں۔ اس لیے کسی بھی تحریک کے ارتقا کی سائنٹفک توجیہ کے لیے ان تاریخی عوامل کا تجزیہ اشد ضروری ہے، جن کے ماحول میں وہ ظہور پذیر ہوئی۔ ان عوامل میں سب سے زیادہ مؤثر اس وقت کی سیاسی تحریکات ہوتی ہیں۔ دوسرے اہم عوامل معاشی اور مذہبی دواعی قرار دیے جاسکتے ہیں۔

فلسفۂ تاریخ کے اس اصول نے سب سے زیادہ مسلم علم الہیئت کو متأثر کیا ہے۔ اس کی تدریجی ترقی سیاسی تقلبات ہی کی رھین منت ہے۔ اسلامی ہیئت کے ہزار سالہ عروج و زوال کا اس اصول کی روشنی میں جائزہ لینا تو مشکل ہے، صرف چوتھی صدی ہجری کی ہیئتی ترقی کو لیا جاتا ہے۔

۱—اس عہد (چوتھی صدی ہجری) کی تاریخ مشاہیر علمائے ہیئت کے کارناموں سے معمور ہے اور اسے بجا طور پر مسلم علم الہیئت کا «عہد زرین» کہا جا سکتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ عہد قلمروے خلافت کے ضعف و اضمحلال کا بدترین زمانہ بھی ہے۔ اس ضعف و اضمحلال میں جن فارق المرکز قوتوں نے کام لیا، اُن میں سب سے اہم ایرانی قوم پرستی کا جذبہ تھا، جو اس زمانہ میں عجمی عصبیت یا «شعوبیت» کہلاتا تھا۔ اس جذبے نے مختلف شکلیں اختیار کیں جن میں سب سے زیادہ خطرناک باطنی یا قرمطی تحریک تھی۔ یہ ایک خفیہ تحریک تھی جو اسلام کی بیخ کنی

اور ایرانی سلطنت کو بحال کرنے کے لیے شروع کی گئی تھی[1]. مگر اس میں اور بھی اسلام دشمن عناصر مثلاً یہود، زنادقہ اور فلاسفہ شامل ہوگئے تھے[2]. ان میں سے مؤخرالذکر کے لیے عبید اللہ بن الحسن القیروانی نے سلیمان بن الحسن بن سعید الجنابی کو مشورہ دیا تھا: «و إذا ظفرت بالفلسفی فاحتفظ به فعلی الفلاسفة معولنا و انا و ایاهم مجمعون»[3] لہذا شروع ہی سے باطنیوں کا رجحان فلسفہ و حکمت کی طرف تھا، چنانچہ ان کے اس فلسفیانہ میلان کے بارے میں شہرستانی نے لکھا ہے: «ثم ان الباطنیة القدیمة قد خلطوا کلامهم ببعض کلام الفلاسفة و صنفوا کتبهم علی ذلک المنهاج»[4] اس طرح باطینوں کی آئیڈیالوجی فلسفہ کی تعلیمات پر استوار ہوتی رہی[5]. اور اس پیہم کوشش کا نتیجہ «رسائل اخوان الصفا» کی شکل میں نمودار ہوا جو جو باطنی حلقوں کی «کتاب مقدس» سمجھے جاتے تھے، چنانچہ شیخ

---

(۱) «و ذکر أصحاب التواریخ ان الذین وضعوا اساس دین الباطنیه کانوا من أولاد المجوس و کانوا مائلین الی دین اسلافهم . . و یوکد ما قلنا من أهل الباطنیة الی دین المعبوس، انا لانجد علی ظهر الارض مجوسیاً و هو موادهم منتظر الظهور هم علی الدیار یظنون ان الملک یعود الیهم بذلک». (البغدادی: الفرق بین الفرق: ۲۶۹-۲۷۱)

(۲) «واتفق اهل المقالات ان اول من أسس هذا المذهب المشؤم قوم من اولاد المجوس و بقایا الخرمیة و الفلاسفة و الیهود» (الدیلمی: قواعد عقائد آل محمد: ۳۱)

(۳) «البلاغ الاکید والناموس الاعظم» بحوالۂ الفرق بین الفرق: ۲۷۸ اسی طرح دیلمی نے لکھا ہے: «و من وجدوه فیلسوفاً فهو منهم قد وصل الحبیب الی المحبوب لان کلهم یثبتون لکل ظاهر باطناً (قواعد عقائد آل محمد: ۲۸)

(٤) الشهرستانی: کتاب الملل والنحل (۱: ۹۰)

(۵) مقریزی نے باطنی دعوت کی منازل تسعہ میں سے چھٹی دعوت کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کے لیے دیکھیے الخطط والآثار (۲: ۲۳۲). اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ آخری منزل میں تو مرید کو صرف فلسفے کی اعلیٰ کتب ہی کے پڑھنے کا مشورہ دیا جاتا تھا (ایضاً ۲: ۲۳۳)

بو علی سینا کے گھر میں بھی جو باطنیت کا پیرو تھا، اس کتاب کا بڑے انہماک سے مطالعہ کیا جاتا تھا۔[1] خود شیخ بھی اس کے مباحث پر غور و خوض کیا کرتا تھا[2]۔

فلسفہ کا اہم جزء ریاضی و ہیئت پر مشتمل ہے، چنانچہ «رسائل اخوان الصفا» کی پہلی جلد کا بیشتر حصہ انہی علوم پر مشتمل ہے۔ لہذا ریاضیات کی تعلیم باطنی دعوت میں اہم مقام رکھتی تھی۔ ابو عبد اللہ بن رزام جو اس تحریک کا قدیم ترین مؤرخ ہے، دُعاۃ کے بارے میں لکھتا ہے «ومن شان دعاتہم ان یتنقلوا فی الارض۔ ۔ وان یتحلی بطرف من الهندسة و معان من تہاویل الفلاسفة[3]»۔

چنانچہ اس تحریک کے اولین بانی عبد اللہ بن میمون القداح[4]، محمد بن الحسین زیدان[5]، حمدان بن قرمط[6]، ابو سعد الجنابی[7] وغیرہم فلسفہ اور

(۱) چنانچہ شیخ اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھتا ہے: «وكان أبي ممن اجاب داعي المصريين و يعد من الاسماعيلية و قد سمع منهم ذكر النفس والعقل على الوجه الذي يقولونه ويعرفونه هم وكذلك أخي كانوا ربما تذاكروا بينهم وأنا أسمعهم ... ويجرون على ألسنتهم ذكر الفلسفة والهندسة وحساب الهند»۔ (سرگزشت ابن سینا مرتبہ سعید نفیسی صفحہ ۱)

(۲) بیہقی شیخ کے بارے میں لکھتا ہے: وأبوه كان يطالع ويتأمل رسالة اخوان الصفا وهو ايضاً احياناً يتأمله»۔ (تتمۂ صوان الحکمۃ: ٤٠)

(۳) مقدمۂ کشف اسرار الباطنیہ: ۱۸۹

(٤) وكان الملعون عارفاً بالنجوم . . . . وكان من أحبار اليهود و اهل الفلسفة الذين يعرفون جميع المذاهب»۔ (کشف اسرار الباطنیة: ۱۹۷)

(۵) «وكان هذا الرجل متفلسفاً حاذقاً بعلم النجوم» (الفہرست: ۲٦۷)

(٦) «كانا يعرفان النجوم و احكام الازمان فدلهما الوقت على تاسيس ما عملاه»۔ (کشف اسرارالباطنیہ: ۱۹۸)

(۷) «كان فيلسوفاً ملعوناً ملك البحرين واليمامة والاحساء» (ایضاً: ۲۰۰) چنانچہ جب وہ (ابو سعید الجنابی) شکست کھاکر ہجر واپس گیا تو ایک قصیدہ

نجوم کے ماہر تھے لیکن نجوم و ہئیت کے ساتھ باطنیوں کے غیر معمولی شغف و اعتناء کا موجب یہ افواہیں تھیں کہ تیسری صدی کے خاتمہ پر مسلمانوں کا دین فنا اور عربوں کی حکومت ختم ہونے والی ہے اور ان کی جگہ ایرانی سلطنت قائم ہوگی اور مجوسی مذہب بحال ہوگا، کیونکہ ستارے اسی کی پیشین گوئی کرتے ہیں۔ عبد القاہر بغدادی نے لکھا ہے:

«وربما استدل اغمارهم على ذالک مما يرويه المجوس عن زرادشت انه قال لكشتاسپ ان الملک يزول عن الفرس الى الروم واليونانية ثم يعود الى الفرس ثم يزول عن الفرس الى العرب ثم يعود الى الفرس. وساعده جاماسپ على ذلک و زعم ان الملک يعود الى العجم لتمام الف و خمس مائة سنة من ظهور زرادشت»[1].

مجوسیت پسند نجومی اس پیشین گوئی کے پورا ہونے کا وقت تیسری صدی کا اختتام بتاتے تھے اور یہی وہ وقت ہے کہ معتضد باللہ (۲۷۹ - ۲۸۹ ھ) کے کمزور جانشینوں کے زیر حکمرانی عباسی خلافت دم توڑ رہی تھی[2]. اس لیے اسلام بیزار حلقوں میں اس کا بڑی بے چینی سے انتظار کیا جارہا تھا۔ پہلے محمد بن الحسین زیداں کو اپنے متعلق یہ مغالطہ رہا کہ میں اس انقلاب کو انجام دونگا۔[3] اس کے مرنے پر ابو سعید الجنابی اس

---

لکھا، جس میں احکام نجوم کے مطابق اپنی فتح کی پیشین گوئی کی ہے:

اغرّكم منى رجوعى الى هجر ... عما قليل سوف يأتيكم الخبر
و اذا طلع المريخ فى ارض بابل ... وقارنه النجمان فالحذر الحذر
سأملک اهل الارض شرقاً ومغربا ... الى قيروان الروم والترک والخزر

(۱) البغدادي: الفرق بين الفرق: ۲۷۱ نیز دیکھیے الآثارالباقية ۲۱۳

(۲) «وقد وافق الوقت الذى ذكره ايام المكتفى و المقتدر و اخلف موعدهم و ما رجع الملک فيه الى المجوس. وكانت القرامطة قبل هذا الميقات يتواعدون فيما بينهم ظهور المنتظر فى القرن السابع فى المثلثة النارية» (الفرق: ۲۷۱)

(۳) «فخبرنى عنه الثقة انه كان يزعم انه وجد فى الحكم النجومى انتقال دولة الاسلام الى دولة الفرس .... فكان يقول فانى لارجو ان اكون سبب ذلک» (الفهرست: ۲٦۷)

خوش فہمی میں مبتلا رہا۔ مگر سنہ ۱۵۰۰ زرادشتی بھی گزر گیا اور پیشین گوئی نہ پورا ہونا تھی نہ پوری ہوئی۔[1]

بااینہمہ باطنی پروپاگنڈے نے اپنی دسہد کاریوں کو ختم نہیں کیا چنانچہ جب آل بویہ بغداد پر قابض ہوگئے (۳۳۴ھ) تو اس پیشین گوئی کا مصداق انہیں بنادیا۔ لیکن البیرونی اس پر بڑی سخت تنقید کرتا ہے[2]۔

بہر حال اس قسم کی مایوسیوں کے دو ہی نتیجے ہوسکتے تھے یا تو احکام نجوم کی اصابت پر سے یقین اٹھ جائے ، یا ان پیہم تکذیبوں کو نجومی حساب کی غلطی کا نتیجہ سمجھا جائے۔ چنانچہ بعض لوگوں نے اس مسئلے پر غور کیا کہ نجومی پیشین گوئی پر کہاں تک اعتماد کیا جاسکتا ہے ، جیسے فارابی (المتوفی ۳۳۹ھ) نے «مقالة فی الجهة التی یصحّ علیها القول باحکام النجوم»[3] میں یا ابو جعفر الخازن نے «کتاب العالمین»[4] میں لیکن

(۱) «و فی آخر سنة الف ومائتین واربعین للإسکندر (۳۱۸ھ) تم من تاریخ زرادشت الف و خمس مائة سنة و ما عاد فیها ملک الارض الی المجوس بل اتسع بعدها نطاق الاسلام فی الارض . . . و فی هذا رغم أنف الباطنیة والمجوس الجاماسبیة الذین حکموا بعود الملک الیهم» (الفرق : ۲۷۲)

(۲) «وظهرت دولة الدیلم لعلی بن بویه الملقب بعماد الدوله فی القرآنات الناریة وهذا هو الوعد الذی کانوا یتواعدون به فی عود الدولة الی الفرس وان لم تکن سیرتهم هی الدولة . ولست ادری کیف آثروا دولة الدیلم دلالة انتقال الممر الی المثلثة الناریة اظهر دلالة علی دولة بنی العباس وهی دولة خراسانیة شرقیة ثم کلاهما تبعدان عن تجدید دولتهم وابعد عن اعادة دینهم» (الآثار الباقیة : ۲۱۳)

(۳) اس موضوع پر فارابی کا ایک اور رسالہ بھی ہے جس کا نام «النکت فیما یصح و ما لا یصح من احکام النجوم» ہے۔ ڈیٹریشی نے اس کے دیگر رسائل کے ساتھ اسے بھی ۱۸۹٦ء میں شائع کیا تھا۔

(٤) ابن ابی الحدید : شرح نهج البلاغة (۱ : ۷۵)

«واعلم ان الناس قد اختلفوا فی احکام النجوم فانکرها جمهور المسلمین و المحققین من الحکماء و قد وقفت لابی جعفر محمد بن الحسین الصغانی المعروف بالخازن صاحب کتاب «زیج الصفائح» علی کلام فی هذا الباب مختصر له سماه

نجوم پسندی ایران کے مزاج میں رچی ہوئی تھی اس لیے علم رجحان اس کی اصابت ہی کی طرف رہا ۔ البتہ پیہم غلیطوں کا نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ ہیئتی مشاہدات اور فلکیاتی حسابات میں مزید دقت نظری کی ضرورت کا احساس شدید سے شدید تر ہونے لگا۔

فلکیاتی اعمال میں اسی دقت نظری کی ضرورت کے احساس نے چوتھی صدی ہجری کو اسلامی ہیئت کی تاریخ کا عہد زریں بنا دیا، کیونکہ ہرچند ایرانی قوم پرست سب کے سب قرمطی نہ تھے[1]، مگر قوم پرستی کے نام پر اور اجانب (عربوں) کے اقتدار سے نفرت کے نتیجے میں انہیں علی العموم اس احیائی تحریک سے دلچسپی تھی. لہذا افاضل روزگار جن کی بہت بڑی اکثریت قرمطی نہیں تھی، ہئیت و فلکیات کی ترقی میں سرگرم و کوشاں نظر آتے ہیں. اس کا ایک اجمالی تذکرہ سابق میں پیش کیا جاچکا ہے[2].

۲۔ یہ بھی تاریخ کا ایک دلچسپ واقعہ ہے کہ وہی عوامل جو ایران کے دوسرے صوبوں میں علم الهئیت کی ترقی کے سلسلے میں شدت سے موثر ہوتے ہیں، محمود غزنوی کی قلمرو میں اس کے جمود و بے اعتنائی کا باعث بن جاتے ہیں. مگر یہ بھی تاریخی تعلیل ہی کا نتیجہ ہے۔

چوتھی صدی ہجری کے آخر میں ہر چند کہ عباسی خلافت کا حقیقی اقتدار ختم ہوچکا تھا اور خلفاء کی حیثیت شطرنج کے مہروں سے زیادہ نہ تھی مگر

---

«کتاب العالمین» : قال ان بعض المصدقین باحکام النجوم و کل المکذبین بها قد زاغوا عن طریق الحق والصواب فان الکثیر من المصدقین بها قد ادخلوا فیها ما لیس فیها وادعوا ما لم یکن درکه بها حتی کثر فیها خطؤهم و ظهر کذبهم وصار ذالک سبباً لتکذیب اکثرالناس بهذا العلم» .

(۱) چنانچہ البیرونی اور ابو نصر بن عراق جو علم الهیئت اور المثلثات کی تاریخ میں نمایاں مقام رکھتے ہیں، باوجود شعوبی ہونے کے قرمطی نہیں تھے . ملاحظہ ہو «معارف» اعظم گڑھ (اگست ۱۹۶۰): البیرونی کا مذہب صفحہ ۱۰۶ ـ ۱۱۰

(۲) مجلۂ علوم اسلامیہ جلد دوم شمارہ ۱ (جون ۱۹۶۱ء) ص ۵٤ ـ ۸۰

فاطمیین مصر کے عروج سے جنھیں قرامطہ کی تائید حاصل تھی، یہ براے نام سربراہی بھی معرض خطر میں نظر آرہی تھی۔ اس لیے القادر باللہ عباسی نے جب محمود کو اس کے بھائی کے مقابلے میں سبکتگین کی سلطنت کا وارث تسلیم کیا تو اس سے قرامطہ کے استیصال کا عہد لے لیا کیونکہ یہ لوگ مشرق میں مصر کے اسماعیلی خلفاء کے ہوا خواہ تھے اور محمود نے اس عہد کو آخر تک نبھایا۔ لہٰذا وہ اُن تمام سرگرمیوں کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتا تھا جو ایرانی احیائیت پسندی سے وابستہ تھیں، یا ان کا شمار تھیں۔ انھیں میں فنون نجوم و ہیئت بھی تھے اسی لیے محمود کی قلمرو میں نجوم و ہیئت کی ترقی کا کوئی چرچا سننے میں نہیں آتا۔ ویسے وہ بڑا علم نواز تھا اور علم و ادب کی سرپرستی میں اپنے معاصرین سے کسی طرح کم نہ تھا[1]۔ مگر نجوم اور نجومیوں کے بارے میں بڑی بے اعتنائی برتتا تھا۔ عوفی نے «جوامع الحکایات» میں لکھا ہے:[2]

> «سلطان محمود بن سبکتگین انارالله برهانه کے دربار میں بیسوں ایسے مشہور و معروف منجم جمع تھے کہ اس زمانے میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے مگر سلطان کسی معاملے میں ان کی راے نہ لیتا تھا۔ ایک مرتبہ کسی منہ لگے مصاحب نے دریافت کیا کہ علم نجوم کے اتنے بڑے بڑے استاد حضور کے پاس جمع ہیں مگر آپ کبھی ان سے کوئی بات نہیں پوچھتے۔ پھر ان کی موجودگی کا کیا فائدہ۔ سلطان نے جواب دیا ۔ ۔ ۔ ملک میں ہر علم و فن کے ماہروں کی موجودگی ضرور ہے (مگر) ۔ ۔ ۔ میرے معاملات کی بنیاد دو باتوں پر ہے: اول خدا پر توکل اور دوسرے شریعت کا فتوی»۔

(۱) «و کان یمین الدولہ محمود بن سبکتگین عاقلاً دیناً خیراً عنده علم و معرفة و صنف له کثیر من الکتب فی فنون العلم و قصده العلماء من اقطار البلاد و کان یکرمهم» ابن الاثیر: الکامل (۹ : ۳۹)

(۲) جوامع الحکایات (اردو ترجمہ) (۲ : ۱۰۷)

محمود نجوم بیزاری میں اتنا متشدد تھا کہ وہ ھیئت کو بھی الحاد و بیدینی سمجھتا تھا ، چنانچہ یاقوت نے لکھا ھے :[1]

«انه ورد علیه رسول من اقصیٰ بلاد الترک و حدث بین یدیه بما شاهد فیما وراء البحر نحوالقطب الجنوبی من دورالشمس علیه ظاهرة فی کل دورها فوق الارض بحیث یبطل اللیل . فتسارع علی عادته فی التشدد فی الدین الی نسبة الرجل الی الالحاد و القرمطة»۔

اسی نجوم بیزاری کا نتیجه تھا کہ اس نے صحیح پیشین گوئی کرنے پر البیرونی کو بجاے انعام دینے کے بالا خانے پر سے پھنکوا دیا اور پھر قید خانه بھیج دیا[2] . اگرچه بعض لوگ اسے اس کی طفلانه مزاجی کا نتیجه سمجھ کر اس کی «گاهے بسلامے برنجند و گاهے بدشنامے خلعت دهند» سے تعبیر کرتے هیں[3] اور بعض سرے سے اس واقعه هی کا انکار کرتے هیں .

لیکن محمود کی یه ساری نجوم بیزاری قرمطی سازشوں کے خلاف حزم و احتیاط کا نتیجه تھی چنانچه جب اس نے مجدالدوله دیلمی کے خلاف رے پر فوج کشی کی تو جہاں باطنیوں کو سولی پر چڑھایا وھیں فلسفۂ و نجوم کی کتابوں کو جلوا ڈالا , البته دوسری کتابیں لدواکر وہ غزنی لے گیا . ابن الأثیر لکھتا ھے :[4]

«وصلب من اصحابه الباطنیة خلقاً کثیراً . . . و أحرق کتب الفلسفة و مذهب الاعتزال والنجوم و اخذ من الکتب ما سوی ذلک مائة حمل» .[4]

ظاهر ھے ان همت شکن حالات میں محمود کی قلمرو کے اندر نجوم و هیئت کو کیا ترقی هوسکتی تھی ، حالانکه همسایه ممالک ان علوم کی ترقی میں قابل قدر خدمات انجام دے رهے تھے .

---

(۱) یاقوت: معجم الادبا ( ٦ : ١١٠ )
(۲) چهار مقاله (گب میموریل ایڈیشن ) : ٥٧
(۳) تاریخ فرشته (۱: ۳۰۸)
(٤) ابن الأثیر : الکامل (۹ : ۱۲۸ )

۳۔ پھر جیسے ھی پانچویں صدی کے وسط میں سلاجقہ بر سراقتدار آتے ھیں، نجوم و ھیئت کا چرچا ختم ھوجاتا ھے۔ سلجوقی خاندان ترک تھا جسے نہ قدیم ایرانی ثقافت سے (جس میں نجوم و ھیئت کی سرپرستی بھی شامل تھی) کوئی دلچسپی تھی اور نہ ایران کی «احیائیت پسند» تحریک سے (جس کا پروپگنڈا نجومی پیشین گوئی کے سہارے کیا جاتا تھا) کوئی تعلق تھا۔ ملک شاہ سلجوقی نے ٤٦٧ھ میں رصد گاہ ضرور تعمیر کرائی مگر اس کا مقصد تحصیل خراج کے لیے نو روز کے تعین کی اصلاح کا تھا، چنانچہ ابن الأثیر اس سال کے واقعات میں لکھتا ھے[۱]:

«و فیها جمع نظام الملک و السلطان ملک شاہ جماعة من اعیان المنجمین و جعلوا النیروز اول نقطة من الحمل وکان النیروز قبل ذلک عند حلول الشمس نصف الحوت. وصار ما فعله السلطان مبدأ التقاویم و فیها أیضاً عمل الرصد للسلطان ملکشاہ۔ ۔ ۔ و بقی الرصد دائراً الی ان مات السلطان سنة خمس و ثمانین واربعمائة فبطل بعد موته».

کارکن وھی لوگ تھے جو بویہی دور کے باقیات الصالحات تھے۔ ان کے بعد سوائے دو تین ناموں جیسے محمد بن احمد المعموری، بہاءالدین ابو محمد الخرقی، عبدالرحمن الخازنی (مصنف زیج سنجری) کے کسی اور ھیئت داں کا نام سننے میں نہیں آتا اور یہ نام بھی ھیئت کی تاریخ میں کوئی اھمیت نہیں رکھتے

اس عرضداشت سے اندازہ ھوگیا ھوگا کہ علوم کے ارتقاء کی جہت تاریخی عوامل سے متعین ھوا کرتی ھے اور اس لیے کسی علم کی ترقی کو کماحقہ سمجھنے کے لیے اس کے سیاسی و اجتماعی پس منظر کو سامنے رکھنا اشد ضروری ھے۔

غالباً اس اعتذار کے بعد میری طول کلامی کو جو میں نے «البیرونی سے پہلے علم المثلثات کا ارتقاء» میں اس کا تاریخی پس منظر پیش کرنے کے سلسلے میں اختیار کی تھی رنگین نوائی نہ سمجھا جائیگا۔ وہ اپنی

(۱) ابن الأثیر: الکامل (۱۰: ۳٤)

جگہ ضروری تھی اور اس کے بغیر علم المثلثات کا ارتقا واضح طور پر نظر کے سامنے نہیں آسکتا تھا.

(ب) پروفیسر صاحب کا ارشاد ہے : «عربوں کے ہاں علوم کی جو تصویر اُنھوں نے کھینچی ہے وہ گو رنگین و دلکش ضرور ہے. لیکن اپنے اصلی خد و خال سے مبرا ہے».

اگر پروفیسر صاحب کی مراد یہ ہے کہ میں اسلامی ثقافت کے شاندار ماضی کی کماحقہ تصویر نہیں کھینچ سکا اور فضلاے اسلام نے علوم حکمیہ کی جو شاندار خدمات انجام دی تھیں، میں ان کے بیان واقعی سے قاصر رہا ہوں تو مجھے اپنی کوتاہ قلمی کا اعتراف ہے. میرا مطالعہ محدود تھا لیکن اگر اُن کا یہ خیال ہے کہ میں نے اس کے بیان میں مبالغہ طرازی سے کام لیا ہے تو یہ سوءظن ہے. میں نے مسلمانوں کے جس کمال کا ذکر کیا ہے اُس کے ثبوت میں مستند حوالے دیے ہیں. رہی اس کی رنگینی و دلکشی تو تاریخ ہمیشہ افسانہ سے زیادہ دلچسپ ہوتی ہے.

(ج) پروفیسر صاحب نے فرمایا ہے «اس خاکہ کے کھینچنے میں بھی ان سے کئی جگہ تسامح ہوا ہے» راقم الحروف کو اپنی اصابت پر اصرار نہیں ہے. مجھ سے ضرور تسامحات سرزد ہوئے ہونگے اور ہونے چاہیں.

خوئے آدم دارم آدم زادہ ام

البتہ میں نے جو کچھ لکھا ہے «مجلۂ علوم اسلامیہ» کے دیگر مقالہ نگاروں کی طرح پوری ذمہ داری اور تحقیق کے ساتھ لکھا ہے. لہذا معروضات ذیل کا مقصد جناب قریشی صاحب کے اعتراضات کی تردید نہیں ہے صرف اپنے موقف کی توضیح ہے.

قریشی صاحب نے ان «مسامحات کی ایک طویل فہرست دی ہے جو مجھ سے سرزد ہوئے ہیں ان کی تعداد ۲۴ ہے ذیل میں ان کے وہ اعتراضات اور ان کے جواب پیش کیے جاتے ہیں :

۱ــ ایک درجہ کے قوس کے وتر :

فاضل معترض کا فرمانا ہے «علم المثلثات کے جن مسائل پر فاضل

مضمون نگار نے بحث کی ہے . . . . . . ان مسائل کے مبادیات سے بھی عہدہ برآ نہیں ہوسکے» (مجلہ : ۱٤۲) یہ ممکن ہے مجھ سے کوتاہیاں ہوئی ہوں لیکن مبادیات ہوں یا مہمات مسائل کسی مسئلے کے پیش پا افتادہ ہونے کا دعویٰ کرکے قدماء کی کاوشوں کا استخفاف نہیں کیا . مثلاً نصف درجہ کے قوس کا جیب یا ایک درجہ کے قوس کا وتر کو دریافت آج ریاضی کے طالب علموں کے لیے کتنی ہی آسان کیوں نہ ہو مگر البیرونی کے زمانہ میں بلکہ نویں صدی ہجری تک مہمات مسائل میں سمجھی جاتی تھی . یہی نہیں بلکہ نویں صدی تک اس کا سائنٹفک حل دریافت نہیں ہوا تھا . قریشی صاحب مزید فرماتے ہیں :

« دائرے کے اندر منتظم کثیرالاضلاع اشکال کے ضلعے دریافت کیے گئے یعنی دائرے کا ثلث ، ربع ، خمس ، سدس ، تسع اور عشر . . . تسع اور عشر کے بالمقابل قوس ٤۰ اور ۳٦ درجوں کے برابر ہوتے ہیں ، ان دونوں قوسوں کا فرق ٤ ہوا جس کا وتر ایک خاص قاعدے سے دریافت کیا گیا اور پھر اس کے نصف قوس کا وتر اور پھر اس کا ربع یعنی ایک درجہ قوس کا وتر دریافت ہوا جو نصف درجہ کی قوس ٹھری »

٤۰ اور ۳٦ درجہ کی قوسوں کے فرق کا وتر اور اس کے چوتھائی یعنی ایک درجہ کے قوس کا وتر نکالنا مسلمّ بشرطیکہ ٤۰ درجہ قوس کا وتر معلوم ہو لیکن یہی تو چوتھی پانچویں صدیٰ میں بلکہ نویں صدی کے نصف اول تک علم المثلثات کے راستہ کا سنگ گراں تھا اور پیہم کوششوں کے باوجود دریافت نہیں ہوسکا چنانچہ البیرونی پہلے « مسبع منتظم » کے وتر کے بارے میں لکھتا ہے :

« ھذا مالم یوجد إلى الآن من زماننا طریق الی استخراجه » .

اس کے بعد « متسع منتظم » ( وتر التسع یا ٤۰ درجہ کے قوس کے وتر ) کے وتر کی معرفت کے عسیرالتحقیق ہونے کے بارے میں لکھتا ہے :

« حال وتر التسع کحال وترالسبع فی خفاء الطریق الی معرفته . . .

(الا) ان الحاجة امس ماتکون وسیاتی للتالی له بالحیل ذکرفیمابعد »

اس کے بعد باب رابع میں جس کا عنوان « فی التحمل لاستخراج وترالتسع » ہے۔ لکھتا ہے :

« کمابعدت معرفة وتر ثلث القوس المعلومة الوتر کذلک بعدت معرفة وتر التسع »

اس کے بعد کہتا ہے : ولم یتات بتتسیع الدائرة الابتحریک الآلات واستعمال قطوع المخروط التی یقل غناؤ ها فی الاعداد »

[کسی نے دائرہ کو نو برابر حصوں میں تقسیم نہیں کیا سوائے میکانکی طریقوں کے یا فصول مخروطیہ کی مدد سے لیکن ان طریقوں سے حاصل شدہ تقسیم سے عددی حساب میں کوئی فائدہ نہیں ہوتا] اسی طرح « رسالہ استخراج الاوتار» : ۱۰۵ - ۱۰۷ میں لکھتا ہے :

والی الآن لم ینفتح لاحدطریق الی معرفة ثلث القوس المعلومة الوتر بالاطلاق و انما یحومون فی المطلوب حول الحق . . . . ولم تیات ذلک بالاصول الهندسیة لاحد الی زماننا هذا و اعیاً الکل استخراجه الا بالحیل المقربة المنحرفة عن طریق الهندسة کما اخرجه الکندی و القد ماء بالآلة و التحریک و استخرجه المحدثون لخواص القطع الزائد من قطوع المخروط »

یہ ناکامی نویں صدی کے نصف اول تک برقرار رہی کیونکہ الغ بیگ (المتوفی ۸۵۳ ھ) نے زیج میں لکھا ہے :

« وجیب یکدرجه که بناء عمل جدول جیب وظل برآن ست الی یومنا هذا هیچ کس بطریقے برهانی استخراج نه‌کرده و همه حکما تصریح کرده اند بآنک طریق عمل استخراج آن نیافته اند و حیلت‌کرده اند تا بتقریب بدست آورده اند. ومابعنایت الله ومنه بطریقے برهانی ملهم شدیم و دربیان آں عملے کتابے بردا ختیم وبآں جیب برهانی ایں جدول عمل کردیم »

اس سے زیادہ وضاحت سے اس کا حوالہ راجہ جے سنگھ سوائی نے

(جس نے تثلیث کے علاوہ تخمیس کا حل بھی دریافت کرلیا تھا) «زیج محمد شاہی» میں دیا ہے:

«ومخفی نماند کہ شاہ مغفور و مبرور مرزا الغ بیگ چون باستخراج جیب ثلث القوس معلومة الجیب موفق شده بود، باستعانت آن جیب یکدرجه طریق برهانی استخراج کرد. اماچون استعلام جیب یک دقیقه موقوف بود برطریق یافتن جیب خمس قوس معلومة الجیب، استخراج جیب دقیقه بحیله استخراج فرموده در زیج وضع نمود. و مابفضل جهان آفرین چون باستخراج جیب خمس القوس معلومة الجیب را یافتیم، جیب یک دقیقه راهم بطریق برهانی برآورده درزیج ثبت کردیم»

غرض کم از کم البیرونی کے زمانہ تک متسع منتظم کا وتر یا بالفاظ دیگر ٤٠ درجہ کی قوس کا وتر بطریق برہانی (محض پٹری اور پرکار کی مدد سے) دریافت نہیں ہوا تھا، مگر فاضل معترض اتنے اہم مسئلہ کو اس طرح سرسری طور پر بیان فرماگیے ہیں گویا یہ ایک پیش پا اُفتادہ مسئلہ ہے.

٢ ـــ علم المثلثات کا آغاز:

« علم المثلثات کا آغاز ہیئتی جداول کی تیاری کے سلسلے میں ہوا تھا» اس پر تعقب فرماتے ہوئے لکھتے ہیں: « یعنی ہیئتی جداول (جس سے ان کی مراد غالباً جیبی وظلی جداول وغیرہاہیں) مقدم ہیں اور مثلثات کا علم مؤخر. حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے» (مجلہ: ١٤٣) جناب قریشی صاحب نے «ہیئتی جداول» کا مفہوم خود ہی «جیبی وظلی جداول» قرار دے لیا اور پھر میری معروض کو غلط معنی پہنا کر اعتراض فرمادیا جو لوگ اردو اصطلاح «جداول» نہ جانتے ہوں ان کے لیے میں نے اس کے ساتھ انگریزی اصطلاح (Astronomical Table) بھی لکھدی تھی اور ریاضیات کے طالب علم جانتے ہیں کہ (Mathematical Tables) اور چیز ہے اور (Astronomical Tables) قطعاً شئ دیگر، مقدم الذکر میں جیبی وظلی

جداول کے علاوہ لوغارثم وغیرہ کی بھی جدولیں ہوتی ہیں مگر اجرام فلکی کی اوضاع و حرکات کی کوئی جدول نہیں ہوتی۔ یہ جداول صرف ہیئت کی کتابوں میں ثبت ہوتی ہیں۔ ان کے لیے عربی اصطلاح «زیج» انگریزی اصطلاح ( Astronomical Tables ) اور اُردو اصطلاح «ہیئتی جداول» ہے۔ مثال کے لیے «زیج الغ بیگ» «زیج شاہجہانی» «زیج محمد شاہی» وغیرہ کو دیکھیے بہت قریبی مثال خود «قانون مسعودی» ہے، جس کے تیسرے مقالہ میں ریاضیاتی جداول میں سے صرف جیبی وظلی جدولیں ضرور ہیں۔ باقی ساری کتاب «ثوابت» کے اوضاع (طول و عرض)، سیارات کے حرکات خاصہ و وسطیہ اور دیگر مظاہر فلکی کی تقاویم پر مشتمل ہے۔

اگر جناب قریشی صاحب نے ( Astronomical Tables ) اور ( Mathematical Tables ) کے مصادیق میں امتیاز کرنے اور مقدم الذکر کا صحیح مفہوم سمجھنے کی کوشش کی ہوتی، تو اُنھیں اس نکتہ چینی کی زحمت نہ اٹھانا پڑتی۔

( ب ) میں نے عرض کیا تھا «قدیم زمانہ میں علم المثلثات المستویہ کا مقصد ایک درجہ کے قوس کے وتر کو دریافت کرنا تھا»۔ فاضل معترض کو اس پر نقض وارد کرنا تھا لہذا فرمایا: «اصل مقصد دائرے کے قوس کو محدود منضبط کرنا تھا . . . اس لیے سب سے پہلے دائرے کے محیط و نصف قطر کی نسبت دریافت کی گئی»۔ کیا اچھا ہوتا اگر فاضل معترض محض قیاس آرائی کے بجاے ریاضیات بالخصوص ہندسہ کی تواریخ کی طرف رجوع فرمالیتے۔ ایک درجہ کے قوس کے وتر کی دریافت اور محیط و نصف قطر کی نسبت کا تعین دو مختلف عملی مسئلے تھے۔ اول الذکر کی اہمیت افادی ہے اور ثانی الذکر تشحید ذہنی سے تعلق رکھتا ہے۔

اس سلسلے میں بنیادی چیز یہ ہے کہ چونکہ مسلمانوں کا ریاضی و ہندسہ اور ہیئت و علم المثلثات یونانی ریاضی و ہیئت کا تسلسل ہے، اس لیے کسی بھی مسئلہ کے ارتقا کی تاریخ سے نیز اس کی ترقی میں مسلمان فضلا کی خدمات کے صحیح اندازہ سے واقفیت کے لیے اس کی یونانی

عہد کی تاریخ پر تفصیلی نظر ہونا انتہائی ضروری ہے ۔ لیکن عموماً مسئلہ کے اس پہلو کے ساتھ وہ اعتنا نہیں کیا جاتا جس کا وہ مستحق ہے ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو عہد اسلام کی کاوشیں نظر انداز ہوجاتی ہیں یا پھر افراق و مبالغہ کے ساتھ پیش کی جاتی ہیں ۔

بہرحال دائرے اور قطر کی نسبت کی دریافت، یا دائرے کے برابر مربع سایے کی تشحید دھن کے سلسلے میں قدیم ترین نام جسے تاریخ نے محفوظ رکھا ہے (Hippocrates) کا ہے ۔ اس کی « سطح ہلالی » (Lune) کی تربیع کی کوشش کا تذکرہ سنبلیقیوس نے « طبعیات ارسطو کی شرح » میں کیا ہے ۔ بعد میں اور یونانی حکما نے اس کوشش کو جاری رکھا، جسکی تفصیل موجب تطویل ہوگی ۔

لیکن جہاں تک ایک درجہ کی قوس کے وتر کی دریافت کا تعلق ہے اسکی اہمیت اور اسکے ساتھ اعتنا و اہتمام اس سے قدیم تر ہے ۔ اس دریافت کے لیے « امہات اوتار » (Principal Chords) کی مقادیر دریافت کی گئی تھیں ۔ « اصول ہندسہ » پر لکھنے والے یونانی مصنفین (جن کے متقدمین کی صف میں (Hippocrates) کا نام لیا جاتا ہے، نہ صرف « امہات اوتار » کی مقادیر سے واقف تھے، بلکہ ان کے خواص پر بھی گہری نظر رکھتے تھے ۔ چنانچہ اقلیدس نے جو (Hippocrates) سے ڈیڑھ سو سال سے زیادہ متأخر نہیں ہے ۔ « امہات اوتار » بالخصوص دائرے کے خمس، عشر اور سدس کے اوتار کے خواص سے « مجسمات خمسہ » (Five Regular Polyhydra) کے بنانے میں مدد لی ہے ۔ مثلاً وہ چوتھے مقالہ کی پندرھویں شکل میں کہتا ہے کہ مسدس دائرہ کا وتر نصف قطر کے برابر ہوتا ہے ۔ یا مثلاً وہ اسی مقالے کی دسویں شکل میں اس مثلث متساوی الساقین کے بنانے کا طریقہ بیان کرتا ہے، جس میں قاعدے پر کا ہر ایک زاویہ، زاویہ راس کا دگنا ہو ۔ یہ مسئلہ دائرے کی « تخمیس » میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور اسی وجہ سے وہ اس مثلث کو « مثلث المخمس » کے نام سے موسوم کرتا ہے ۔ پھر وہ تیرھویں مقالہ کی

گیارھویں شکل میں کہتا ھے کہ ثلث دائرے کے وتر کا مربع نصف قطر کے مربع کا تین گنا ھوتا ھے . لیکن زیادہ دلچسپ اس مقالہ کی بارھویں اور تیرھویں شکلیں ھیں . بارھویں شکل میں کہتا ھے کہ اگر دائرے کے سدس اور عشر کے اوتار کو ایک سیدھ میں ملاکر رکھ دیا جائے تو خط مجموع نقطۂ اتصال پر « نسبت ذات وسط وطرفین» میں منقسم ھوجاتا ھے یا $S^2_6=S_{10}\,(S_6+S_{10})$ تیرھویں شکل میں کہتا ھے کہ خمس دائرہ کا مربع مسدس دائرے کے مربع اور عشر دائرہ کے مربع کے مجموعہ کے برابر ھوتا ھے.

یا $S^2_5=S_6^2+S^2_{10}$

لیکن اقلیدس کی « اصول ھندسہ » صرف ھندسہ کی کتاب تھی اور اس کا مقصد تالیف « مجسمات خمسہ » کے بنانے کے برھانی طرق کی دریافت تھا جو افلاطونی فلسفہ میں مخصوص اھمیت رکھتے ھیں . اسکے لیے اس نے مخمس ، معشر اور مسدس کے اضلاع کے باھمی خواص سے بھی مدد لی . لیکن اس مسئلہ پر باقاعدہ بحث بطلیموس (۸۷ - ۱۶۵ء) نے «المجسطی» میں کی ، غالباً اس سے پہلے ارخس اور دیگر ھیئت‌دانوں نے بھی اپنی اپنی تصانیف میں اسکے ساتھ اعتنا کیا ھوگا مگر ان کی کتابیں بادحوادث کی نذر ھوچکی ھیں .

بہر حال « المجسطی » کے پہلے مقالہ کا بیشتر حصہ ان « امہات اوتار » کی دریافت پر مشتمل ھے ، بالخصوص خمس دائرہ اور عشر دائرہ کے اوتار کی قیمت پر : [ الفصل العاشرفی مقادیر الاوتار - نبدء بضلعی المعشر و المخمس ] لیکن اس طول عمل کا مقصد ایک درجہ کے قوس کے وتر کی دریافت تھا بطلیموس نے $1\frac{1}{2}$ درجہ کے قوس کا وتر معلوم کیا پھر اسکے نصف $\frac{3}{4}$ درجہ کا وتر معلوم کیا اور پھر ان کے موازنے سے ایک درجہ کا وتر تقریبی طور پر دریافت کیا جو ثانیوں تک صحیح ھے .

چوتھی صدی ھجری میں یعقوب ( غالباً ابو یعقوب ) السنجری نے ۳ درجہ اور اسکے ربع $\frac{3}{4}$ درجہ کے اوتار کی ترکیب سے $3\frac{3}{4}$ درجہ کا وتر دریافت کیا . بعد ازاں بقاعدہ تنصیف اسکے ربع یعنی $\frac{15}{16}$ درجہ کا

وتر معلوم کیا اور پھر اس میں اس کا $\frac{1}{15}$ جمع کرکے ایک درجہ کا وتر بزعم خویش معلوم کیا ۔ مگر البیرونی کہتا ہے :

« و ذلک وترالجزءالواحد من غیرحاجة مازعم الی تطویل بطلیموس فیه . و ما احسن تلطف یعقوب لمرامه لولا افساده الخاتمة» .

لیکن البیرونی کی یہ تنقید اسکے «اصرارعلی التحقیق» کی بنا پر ہے ورنہ بقول اسکے « تقریبی» حیثیت سے بطلیموس اور ابو یعقوب دونوں کے عمل میں کوئی فرق نہیں ۔ رہی یہ بات کہ بطلیموس اپنے عمل کی خامی سے واقف تھا اور ابو یعقوب اپنے عمل کی غلطی پر متنبہ نہ تھا تو یہ بات البیرونی کے زمانہ میں تھی جو کہتا تھا کہ قوس اور اس کے وتر کی تساوی غیر ممکن الوقوع ہے (و ذلک ان هذا التساوی غیر کائن فی الحقیقة) ۔ لیکن جدید ریاضیات اس شعور (بطلیموس) اور لاشعور (ابو یعقوب) کے امتیاز کو ختم کرچکی ہے اور موجودہ علم‌المثلثات کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ جیسے جیسے قوس کم ہوتی جاتی ہے قوس اور اس کی جیب ایک دوسرے کے قریب ہوتے جاتے ہیں ۔ اس موضوع سے متعلق ٹاڈھنٹر (Todhunter) کی تصریحات ملاحظہ ہوں ۔

۳ ـ الشکل القطاع کے بدل :

میں نے عرض کیا تھا « الشکل القطاع ... یونانی ہیئت کی تاریخ میں بڑے عرصہ تک مسلمان ہیئت دانوں میں بھی جب تک ضابطہ الجیوب (Sine Formulae) اور اسکے بدل دریافت نہیں ہوئے تھے تمام مثلثاتی حسابوں کی اصل سمجھی جاتی تھی » ۔

قریشی صاحب نے اس پر تعقب فرمایا ہے :

« شکل مغنی ہی کا دوسرا نام ضابطہ جیوب (Sine Equation) ہے ۔ اس شکل کا کوئی بدل نہیں جیسا کہ فاضل مضمون نگار کا بیان ہے بلکہ یہی قانون هئیت ہے » ۔

ایسا اندیشہ ہوتا ہے کہ میرے مافی الضمیر کے سمجھنے میں فاضل معترض نے غیر ضروری تعجیل سے کام لیا ہے ۔

(الف) کیوں کہ میں نے وهی عرض کیا تھا جو محقق طوسی نے « شکل القطاع » (صفحہ ۸۸) میں اس شکل کے بارے میں لکھا ھے :

«ولم یزل قدماء علم الهندسة یعملون هذا الشکل فی هذه المطالب وعلیه یعتمدون ... اما المتأخرون ... استنبطوا اشکالاً تقوم مقام القطاع فی فوائده».

آگے چل کر وہ (محقق طوسی) صفحہ ۱۰۷ پر شکل قطاع کے دو « بدل » قائم مقام بتاتے ھیں :

« و للمتأخرین فی ذلک قانونان کلیان یعرف احدهما بالشکل المغنی عن القطاع فانه یقوم ... مقام الشکل القطاع ...والثانی یعرف بالشکل الظلی و هو ایضاً فی معظم المطالب یقوم مقام القطاع ... و یکون العمل به فی بعض المواضع اسهل من العمل بالمغنی و فی بعض بالضد » .

اس کے بعد اگر « شکل ظلیّ » یا « شکل نفی » کو ایک دوسرے کا بدل نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے . غالباً اس سیدھی سادھی حقیقت کے لیے اسکے علاوہ اور کوئی انداز تعبیر نہیں ھے .

زیادہ بہتر ہوگا اگر فاضل معترض ریاضیات کے کسی پروفیسر سے اس معاملہ میں رجوع فرمائیں . وہ بتائیں گے کہ آج بھی « شکل ظلی » « شکل مغنی » کے بدل کے طور پر مستعمل ھوتی ھے . نیز « تعدیل الجیب » کی طرح « تعدیل تمام الجیب » (Cosine Equation) بھی علم المثلثات الکرویہ میں اساسی حیثیت رکھتی ھے .

(ب) « الخجندی نے اس شکل کا نام قانون الهیئت رکھا تھا » میری یہ معروض بھی محقق طوسی کی « شکل القطاع » ھی سے ماخود تھی : « وقد لقب ابو محمود الخجندی هذا الشکل بقانون الهیئة » . (کتاب شکل القطاع صفحہ ۱۲۵) اور محقق طوسی کی یہ تصریح خود البیرونی کی «مقالید علم الهیئة » (ورق ۱۷۷ ب) سے ماخوذ ھے .

« ولقیت أبا محمود حامد بن محمد الخجندی وأخرج الیّ کتاباً ... أورد فی اوائله هذا الشکل ... سماه قانون الهیئة »[1] .

(۱) بحوالہ برھان (مئی سنہ ۱۹۵۵) صفحہ ۳۰۲

اسکے بعد فاضل معترض کا یہ تعقب ناقابل فہم ہے کہ «شکل مغنی . . . کا کوئی بدل نہیں جیسا کہ فاضل مضمون نگار کا بیان ہے بلکہ یہی قانون ہیئت ہے» .

٤ ـ برهم سدھانت کے پہلے مترجم کا نام :

(الف) قریشی صاحب فرماتے ہیں : «برهم اسپٹھ سدھانت کے ترجمے کے بارے میں ابراهیم بن حبیب الفزاری کا تذکرہ ہے لیکن چند سطروں کے بعد یہ نام محمد بن ابراهیم بن حبیب الفزاری ہوگیا ہے» . میں نے «برهم سدھانت» کے ترجمہ کے بارے میں کبھی ابراهیم بن حبیب الفزاری کا ذکر نہیں کیا . میرے مضمون میں اس ترجمہ کا تین مرتبہ ذکر آیا ہے اور ہر مرتبہ محمد بن ابراهیم الفزاری کو اس کا مترجم بتایا گیا ہے :

«محمد بن ابراهیم الفزاری اور یعقوب بن طارق نے ہندو ہیئت (سدھانت) کو عربی میں منتقل کیا» (مجلہ : ٢٦ ص ٢١ـ٢٢)

«پس محمد بن ابراهیم الفزاری نے اس کام (برهم سدھانت کےترجمہ) کو انجام دیا» (مجلہ ٢٨ ص ١٩ ـ ٢٠)

«محمد بن ابراهیم الفزاری کی اس کتاب (ترجمہ برهم سدھانت) پر ماہرین ہیئت کا تیسری صدی کے آغاز تک عمل رہا» . (مجلہ ٢٨ ص ٢٣ ـ ٢٤) .

(ب) آگے چل‌کر فاضل معترض فرماتے ہیں : «فاضل مضمون نگار کو باپ اور بیٹے کے نام میں شاید اس لیے التباس ہوگیا ہے کہ . . . ابن القفطی اور دوسرے تذکرہ نگاروں نے ان دونوں فضلا کو ایک ہی سمجھ‌کر ان کے ناموں کے التباس میں دھوکا کھایا ہے . نلینو نے اس پر تفصیل سے بحث کی ہے . وہ آخر میں لکھتا ہے :

اس طویل بحث سے ہم اغلباً یہ نتیجہ نکالتے ہیں : اول فزاری سے مراد ایک ہی شخص ہے . . . دوسرے اس کا نام زیادہ قرین قیاس ابراهیم بن حبیب تھا نہ کہ محمد بن ابراهیم . . . تیسرے یہ کہ ابن القفطی

نے اپنے مختلف مآخذ کی بنا پر ایک ہی شخص کو دو نام دے دیے ہیں»۔

فاضل معترض نے مذکورالصدر تعقب محض اس بنا پر کیا ہے کہ میری رائے نلینو کی رائے سے مختلف تھی، جبکہ انھوں نے اس پر غیر مشروط اعتماد کرلیا ہے نلینو میرے لیے واجب الاحترام محقق ہے مگر اس پر غیر مشروط اعتماد میری طالب علمانہ ذمہ‌داری کے منافی تھا، کیونکہ اکثر مقامات پر میرے لیے اس کا حرفاً حرفاً تسلیم کرنا ناممکن ہوگیا تھا۔ مثلاً علم‌المثلثات الکرویہ کی جو تاریخ نلینو نے دی ہے میں نے اسکے بجائے محقق طوسی کی «شکل القطاع» کا اتباع احوط سمجھا جو البیرونی کی «مقالید علم الهیئة» پر مبنی ہے۔ نلینو پر غیر مشروط اعتماد البیرونی کی تکذیب کے مترادف تھا۔ اس کی تفصیل یہ ہے:

«ضابطۂ جیوب» (شکل مغنی) کی دریافت کے شرف‌اولیت میں تو نزاع ہے کہ یہ ابو الوفاء کی دریافت ہے یا ابونصر بن عراق کی مگر «ضابطۂ الاظلال» بلا کسی اختلاف کے ابوالوفاء (۳۲۸-۳۸۸ھ) کی دریافت ہے جیسا کہ طوسی نے «مقالید علم‌الهیئة» سے نقل کیا ہے: «السبق فی استنباط هذا الشکل لابی الوفاء البوزجانی بلا تنازع من غیره علی ماذکره ابوریحان»[1] لیکن نلینو کا کہنا ہے کہ اس ضابطہ کے استعمال میں حبش بن عبداللہ جو خلیفۂ مأمون اور معتصم کے زمانہ کا ہیئت داں ہے، سبقت کر چکا تھا[2]:

> «و فی اواخر القرن الثالث أو اوائل الرابع توصلت العرب الی معرفة کل هذه القواعد المختصة بالمثلثات الکرویة القائمة الزاویة، اذ وجدتها مستعملة لحل مسائل علم الهیئة الکروی فی النسخة الخطیة الوحیدة من زیج احمد بن عبدالله المعروف بحبش الحاسب المحفوظة بمکتبة برلین .... فخطأ نصیر الدین المتوفی سنة ٦٧٢/ ١٢٧٤م فی نسب

---

(۱) الشکل‌القطاع: ۱۲٦

(۲) علم‌الفلک تاریخه عندالعرب ۲٤۸ _ ۲٤۹

اختراع استعمال الاظلال لحل المثلثات الكروية القائمة الزاوية الی ابی الوفاء البوزجانی المتوفی سنة ۳۸۸ ھ».

قریشی صاحب بھی نلینو کے اس «تخطیہ» سے ناواقف نہیں ہیں کیونکہ اورینٹل کالج میگزین (فروری ۱۹۶۱ ء) میں صفحہ ۵۹ پر فرماتے ہیں:

«اطالوی پروفیسر کارلو نلینو کے قول کے مطابق ان قواعد کا علم عربوں کو تیسری صدی کے اواخر یا چوتھی صدی ہجری کی ابتدا میں ہوچکا تھا کیونکہ ان کا استعمال برلین کے نسخۂ زیج احمد بن عبداللہ المعروف حبش الحاسب میں موجود ہے۔ اس لیے اس کا ادعا ہے کہ بقول محقق طوسی اس کی اولیت کا سہرا البیرونی کے اُستاد ابونصر علی بن عراق کے سر نہیں ہوسکتا»[1].

مگر یہ محض محقق طوسی کا تخطئہ نہیں ہے۔ یہ خود البیرونی کا تخطئہ ہے کیونکہ نلینو خود حاشیہ میں لکھتا ہے:

«کتاب الشکل القطاع المطبوع فی القسطنطنیة سنہ ۱۳۰۹ ص ۱۲۶. واعتمد نصیر الدین فی قوله هذا علی ابی الریحان البیرونی المتوفی سنة ۴۴۰ ھ».

اس کے بعد نلینو پر غیر مشروط اعتماد اور اُس کی تصویب مطلق اس بات کے مترادف ہوگی کہ نہ صرف البیرونی نے غلطی سے شکل ظلی کا شرف اولیت ابوالوفاء البوزجانی کو دیدیا ہے، بلکہ یہ کہ اس باب میں اُس نے جان بوجھ کر غلط بیانی سے کام لیا ہے کیونکہ حبش کی زیج کا البیرونی نے تحقیقی مطالعہ کیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس کے مسائل کے دلائل بھی

---

(۱) یہاں فاضل معترض سے دو غلطیاں ہوئی ہیں: نلینو نے لکھا تھا کہ محقق طوسی نے ابوالوفاء البوزجانی کی طرف شکل ظلی کی اختراع کرکے غلطی کی ہے قریشی صاحب نے ابوالوفاء البوزجانی کے بجائے ابونصر بن عراق کردیا۔ دوسرے یہ کہ ابونصر بن عراق کا نام علی نہیں بلکہ «منصور» ہے۔ علی اس کے باپ کا نام ہے۔

«تعلیل زیج حبش» کے عنوان سے مرتب کرلیے تھے جن کا وہ قانون مسعودی میں بار بار حوالہ دیتا ہے[1].

اس صورت حال کے بعد دو ہی شکلیں ہیں. یا تو پروفیسر نلینو کا آنکھ بند کر کے اتباع کیا جائے، جس کے معنی البیرونی کی تکذیب کے ہیں. مگر اس کے بعد وہ بنیاد ہی منہدم ہوئی جاتی ہے جس پر علمی تحقیقات کا قصر منیع تعمیر ہونا ہے، یا البیرونی اور دیگر قدیم مصادر کو درخور اعتنا سمجھا جائے اور جدید محققین پر مشروط اعتماد کیا جائے میں نے دوسری شکل اختیار کی ہے، چنانچہ جہاں قدیم مأخذ و مصادر سے نلینو یا دیگر مستشرقین کے افادات کی تائید ہوتی ہے اختلاف کی افادات کی تائید ہوتی ہے، اختلاف کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتا. جہاں نہیں ہوتی وہاں قدیم مصادر و مآخذ ہی کا اتباع کرتا ہوں.

نلینو نے اپنی کتاب علم الفلک تاریخه عندالعرب میں ابن القفطی پر بڑی شدید تنقید کی ہے. بااینهمه ابن القفطی کی جلالت قدر اور اس کی کتاب کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، خود نلینو کو اقرار ہے کہ ابن القفطی کے تسامحات نا قابل اعتناء ہیں اور اپنی اس نکته چینی کی معذرت کرتا ہے[2].

کیا یہی اصول خود نلینو پر اعتماد کے باب میں ملحوظ نہیں رکھا جانا چاہیے که اس کی وسعت معلومات، وثوق روایت اور شدت اجتہاد کے

---

(۱) البیرونی نے «مقالید علم الهیئة» کے مقدمے میں لکھا ہے که ابوالوفاء نے سمت قبله کے طریق میں حبش الحاسب کے طریقه کے علاوه کوئی نئی بات نہیں کہی (برگ ۱۷۷ ظ) (بحواله برهان مئی ۱۹۵۵ء ص۳۰۳) لیکن نلینو کا دعویٰ ہے که شکل خفی اور شکل ظلی وغیره سب کی سب (کلّ هذه القواعد المختصة بالمثلثات الكروية القائمة الزاوية) حبش کو معلوم تھیں. فیا للعجب! کیونکه اگر ایسا ہوتا تو البیرونی ضرور اس کا ذکر کرتا، کتمان حق اُس سے بعید ہے.

(۱) نلینو: علم الفلک تاریخه عندالعرب: ٦١

باوجود اس سے استفادہ کرتے وقت ذمہ دارانہ طور پر بیدار مغزی و ہوش مندی اور ناقدانہ بصیرت کو کام میں لایا جائے غالباً اس سے اختلاف کے سلسلے میں میری یہ معذرت کافی ہوگی۔

جہاں تک محمد بن ابراہیم الفزاری اور ابراہیم بن حبیب الفزاری کی شخصیتوں کے ایک یا دو ہونے کا تعلق ہے، تاریخی تنقید کے علاوہ افاضل مستشرقین کی تحقیق کو بھی ہمیں اپنے سامنے رکھنا ہے اس سلسلے میں زخاؤ نے «کتاب الہند» کے انگریزی ترجمے کی تعلیقات میں اور فلپ حتی نے جو کچھ لکھا ہے دیکھا جائے[1] یہ دونوں مترجم کا نام محمد بن ابراہیم الفزاری بتاتے ہیں

بہر حال ملیو کے دعوے کی اساس محض قیاس ہے کہ چونکہ اس زمانہ میں ایک محدث کا بھی یہی نام تھا (ابواسحاق محمد بن ابراہیم الفزاری) اس لیے بعض مولفین نے غلطی سے ہیئت داں الفزاری کا نام بھی محدث الفزاری کے نام پر محمد بن ابراہیم الفزاری رکھدیا[2]:

ظاہر ہے اتنا سا بے بنیاد احتمال مصنفین سابقین کی تقلید و تخطیہ کے لیے کافی نہیں ہے اسی طرح جو کچھ اس نے مسعودی سے نقل کیا ہے قرائن اس کی تضعیف کرتے ہیں کیونکہ مسعودی جس الفزاری کا ذکر کرتا ہے، وہ خود ملیو کی تحقیق کے مطابق سنہ ۱۷۲ کے بعد کا ہے۔ اس لیے وہ اس «الفزاری» کا عین نہیں ہوسکتا جس نے اکتیس سال قبل شہر بغداد کی نگرانی کی تھی۔ اس واضح الیعقوبی لکھتا ہے[3]:

«خبر بهذا جماعة من المشائخ أن المنصور ... اختطها (بغداد) فی شهر ربیع الاول سنة احدی واربعین ومائة و وضع اساس المدینة فی وقت اختاره نوبخت المنجم و ماشاء الله بن ساریة ... وكان الذین هندسوها ... بحضرة نوبخت و ابراهیم بن محمد الفزاری والطبری المنجمین اصحاب الحساب»

(۱) Albiruni's India Vol. II, p 310.

(۲) علم الفلک : ۱۵۹

(۳) البلدان : ۲۳۸

ظاهر ہے جن لوگوں کو بناء بغداد کی نگرانی جیسا اہم کام تفویض کیا گیا ہوگا وہ یقیناً پختہ کار اور عمر رسیدہ ہونگے۔ چنانچہ نوبخت منصور کی زندگی ہی میں ۱۵۸ ھ سے قبل بوڑھا ہوکر کار ہائے مفوضہ کی انجام دہی سے عاجز ہوگیا تھا اور اس کی پیرانہ سالی کی بنا پر منصور نے اس کے بیٹے کو منجم باشی بنایا تھا۔ لہذا نوبخت کے ساتھی انفزاری کے بارے میں کس طرح تصور کیا جاسکتا ہے کہ وہ تیس چالیس سال اور زندہ رہا ہوگا اور دور دراز صوبوں کی مساحت و مسافت کو دریافت کرکے قلمبند کیا ہوگا۔

اس لیے صورت حال یہ معلوم ہوتی ہے کہ جس طرح نوبخت کے ضعیف ہوجانے پر اس کا بیٹا ابوسہل منصور کا خصوصی جوتشی مقرر ہوا اس طرح ابراھیم بن حبیب الفزاری کے بعد جو ۱٤۱ ھ میں ہی کافی بوڑھا رہا ہوگا، محمد بن ابراھیم الفزاری اس کی جگہ دربار کا خصوصی ہیئت داں مقرر ہوا اور ۱۵٦ ھ میں برھم سدھانت کے ترجمہ پر مامور ہوا اور جس طرح نوبخت کا بیٹا ابوسہل بن نوبخت بناء بغداد کے تیس چالیس سال بعد ہارون الرشید کے «خزانة الحکمة» کا لائبریرین مقرر ہوتا ہے، اسی طرح باپ کی بناء بغداد کی نگرانی کے تیس چالیس سال بعد محمد بن ابرھیم الفزاری عالم اسلامی کا جغرافیہ مرتب کرتا ہے۔

اس استدلال سے قطع نظر مصنفین سابقین کی تصریحات سے بھی ابن القفطی کے قول کی تائید ہوتی ہے۔ ان میں سے یاقوت حموی (صاحب معجم البلدان) اور صلاح الدین صفوی (صاحب الوافی بالوفیات) نسبتاً متأخر ہیں۔ لیکن البیرونی (۳٦۰-٤٤۰ ھ) اور قاضی صاعد اندلسی (المتوفی ٤٦۲ ھ) تو متقدمین میں سے ہیں۔ قاضی صاعد اندلسی (جو ابن القفطی کا ماخذ ہے) «طبقات الامم» (ص ۷۸) میں لکھتا ہے: «واما علم النجوم فادل من عنیٰ به فی هذه الدولة محمد بن ابراهیم الفزاری» اس کے بعد ہندستانی وفد کا قصہ لکھتا ہے پھر کہتا ہے: «فتولی ذلک محمد بن ابراهیم انفزاری و عمل منه کتاباً بسمیه المنجمون بالسند هندالکبیر»۔

اسی طرح البیرونی «استخراج الاوتار» ( ص ۱۲ ) میں جو ۴۲۷ھ سے قبل تصنیف ہوچکی تھی ، لکھتا ہے : «فی حل التعدیل بحساب آوردہ محمد بن ابراہیم الفزاری فی زیج السند ہند» ان شواہد کے بعد جنہیں نظر انداز کرنے کی صورت میں عہد اسلام کی علوم حکمیہ کی تاریخ مرتب کرنے کی کوئی اساس ہی باقی نہیں رہتی ، نلینو کے ساتھ اتفاق نہیں کیا جاسکتا محمد بن ابراہیم الفزاری اور ابراہم بن حبیب الفزاری قطعاً دو مختلف شخصیتیں ہیں ۔

۵۔ اسلامی تاریخ میں مساحت و ہندسہ کا آغاز :

فاضل معترض کا فرمانا ہے «اس زمانہ میں علم مساحت کا آغاز ہو تو ہو لیکن علم المثلثات تو ابھی مسلمانوں سے کوسوں دور تھا» ۔

( الف ) لیکن میں نے کبھی یہ نہیں لکھا کہ عہد فاروقی میں «علم المثلثات» کا چرچا تھا ۔ علم المثلثات کے لیے ہندسہ اور ہیئت کا ایک خاص درجہ مطلوب ہے اور صدر اسلام میں یہ مفقود تھا ۔ اس لیے میں ایسا بے بنیاد دعویٰ تو نہیں کرسکتا تھا ۔ مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ ہندسہ و ہیئت دونوں کے جرثومے ظہور میں آچکے تھے ۔ ہیئت کے لیے قرآن و حدیث نے تشجیع کی تھی اور ہندسہ کی بنیاد مساحت کے ضمن میں عہد فاروقی کے اندر پڑی ۔ میرے خیال میں علم المثلثات کے آغاز و ارتقاء سے بیشتر اس کی ہندسی بنیاد ( مساحت ) سے تعرض ضروری تھا ۔ رہا مساحت کے ذکر سے علم المثلثات کا شبہ تو یہ فاضل تعقب نگار کی تعجیل فرمائی ہے ۔

( ب ) قریشی صاحب کا یہ تردد کہ «اس زمانہ میں علم مساحت کا آغاز ہو تو ہو» بے بنیاد ہے ۔ البلاذری نے «فتوح البلدان» ( ص ۲۲۷ ) میں لکھا ہے : «حدثنی القاسم بن سلام ۔ ۔ ۔ عن الشعبی ان عمر بن الخطاب بعث عثمان بن حنیف الانصاری یمسح السواد ، فوجدہ ستۃ و ثلاثین الف الف جریب» ۔

دوسری جگہ ( ص ۲۷۸ ) میں لکھا ہے : «حدثنا القاسم بن سلام

ان عمر بن الخطاب بعث عمار بن یاسر علی صلاۃ اھل الکوفۃ و جیوشھم و عبداللہ بن مسعود علی قضائھم و بیت مالھم و عثمان بن حنیف علی مساحۃ الارض . . . فمسح عثمان بن حنیف الارض»

اسی طرح الماوردی نے «احکام السلطانیہ» میں لکھا ھے : «وضرب عمر رضی اللہ عنہ علی ناحیۃ أخری غیرھا غیر ھذا القدر . فاستعمل عثمان بن حنیف علیہ و امرہ بالمساحۃ و وضع ما تحتملہ الارض من خراجھا فمسح ووضع علی کل جریب من الکرم والشجرالملتف عشرہ دراھم» . (احکام السلطانیہ ص ۱۳۲-۱۳۳)

٦—ایراٹوستھنیس :

فاضل معترض کا فرمانا ھے : «کس قدر تعجب کا مقام ھے کہ تذکرہ نویس مشھور یونانی جغرافیہ دان کا نام ایراٹوستھینس لکھتا ھے حالانکہ اس کی معرب شکل اراتستانس عربوں کے ھاں عام طور پر مستعمل ھے».

لیکن یہ اتنا اھم مسئلہ تو نہ تھا جس کے لیے اس درجہ خفگی کا اظہار یا استبعاد فرمایا جاے کیونکہ اگر «عربوں کے ھاں» سے ان کی مراد عہد حاضر کے عربوں کی تصانیف ھیں تو واجب التقلید نہیں۔

لیکن اگر قدیم عرب مصنفین سے مراد ھے تو اُن کے یہاں بھی اس کا کوئی مستقل املا نہیں تھا. خود البیرونی کے یہاں فاضل معترض کے بیان کے مطابق یہ املا «اراتستانس» ھے اور «قانون مسعودی» (جلد ثانی ص ۵۲۸) میں یہ «اراطشتانوس» ھے بہرحال اردو کے ادیب وبلغاء اسے «ایراٹوستھنیس» ھی لکھتے ھیں جس طرح وہ «حارج» (George) کو «جرجی» نہیں لکھتے .

۷ - تربیع الدائرہ کی تحریف :

فاضل معترض کا فرمانا ھے : «بنو موسیٰ کا ذکر کرتے ھوئے ریاضی کے تین بڑے مسائل : تربیع الدائرہ ، تضحیف المکعب اور تثلیث الزاویہ کی طرف اشارہ ھے : اس میں اول غالباً تسبیع الدائرہ (Inscription of a regular heptagon in a circle) سے مراد ھے» . مجھے اندیشہ ھے کہ فاضل

معترض نے یہاں تجاہل عارفانہ سے کام لیا ہے کیونکہ اگر وہ (Duplication of a Cube) کے عربی مترادف « تضحیف المکعب » کو بلا تکلف استعمال کرسکتے ہیں (حالانکہ میرے مضمون میں صرف انگریزی اصطلاح ہی تھی، اس کا عربی مترادف رہ گیا تھا) تو یہ نہ ممکن ہے کہ وہ « تربیع الدائرہ » سے واقف نہوں اور اگر بفرض محال وہ اس اردو اصطلاح واقف نہ بھی ہو تو انگریزی اصطلاح (Quadrature of a Circle) سے تو ضرور واقف ہونا چاہیے۔ ریاضیات کے معمولی طالب علم بھی عہد قدیم « مسائل ثلثہ » کے ضمن میں اسے جانتے ہیں مگر جان بوجھ کر انہوں نے اسے میری یا کمپوزیٹر کی غلطی سمجھ لیا اور « تسبیع الدائرہ » سے اس کی اصلاح فرمادی، حالانکہ دائرے کے سات برابر حصوں میں تقسیم یا دائرہ میں منتظم مسبّع کے کھینچنے کا عہد قدیم کے ان « مسائل ثلثہ » سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔

۸ ـ کتب علم الانواء:

فاضل معترض کا فرمانا ہے: « علم الانواء پر نلینو نے . . . کوئی ۲۲ ادیبوں کا ذکر کیا ہے . . . ان ۲۲ ناموں میں سے بہ تغیر و تبدل ہمارے فاضل مضمون نگار نے ۲۱ کا تو ذکر کیا ہے۔ لیکن قطرب النحوی کو نہ معلوم کس بنا پر وہ حذف کرگئے ہیں۔ ابوالقاسم عبدالرحمن بن اسحٰق الزجاجی کو صدف الرحاح لکھا ہے اور الاخفش الاصغر کی الاحفش الصغیر سے اصلاح کی ہے »۔

اس عجیب تعقب کا منشاء محدود مطالعہ ہے۔ نلینو سے پہلے اور صلاء نے بھی « کتاب الانواء » کے لکھنے والوں کی فہرست دی ہے ان میں حاجی خلیفہ کی « کشف الظنون » (مطبوعہ مطبع عالم) میرے پیش نظر تھی۔ اس کی جلد ثانی ص ۲٦٦ پر « کتاب الانواء » کے زیر عنوان اس موضوع کے مصنفین کی ایک فہرست دی ہے۔ میں نے اسی کو بنیاد بنایا تھا۔ اس کے علاوہ ابن الندیم نے « الفہرست » (مصری ایڈیشن) کے ص ۱۲۰ پر « تسمیة الکتب المؤلفة فی الانواء » کے زیر عنوان ایک

اور فہرست دی ہے ، میں نے اس سے بھی استفادہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ بعض مصنفین کے نام « الفہرست » مقالہ ہفتم[1] اور « عیون الانباء فی طبقات الاطباء »[2] سے بھی لیے تھے۔ لیکن چونکہ میں بالاختصاص اسی مبحث ( کتب انواء ) پر نہیں لکھ رہا تھا۔ اس لیے مصادر کا نام دینے کی ضرورت نہیں سمجھی اور نہ استقصاء ہی کی کوشش کی گئی۔ جہاں اصل مصادر و مآخذ سے مراجعہ ممکن ہو وہاں معاصرین کی خوشہ چینی قطعاً غیر ضروری ہے۔

الف ـــ « قطرب النحوی » کا نام چونکہ « کشف الظنون » کی دی ہوئی فہرست میں نہیں تھا ، اس لیے نہیں لکھا گیا اور پھر استقصاء بھی منظور نہیں تھا۔

ب ـــ کشف الظنون میں ابوالقاسم عبدالرحمنٰ بن اسحاق الزجاجی کا نام نہیں ہے ، بلکہ « ابواسحاق ابراهیم بن محمد الزجاج النحوی المتوفی ۳۱۰ عشرہ وثلثہ مائة » کا نام ہے۔ الفہرست لابن الندیم میں بھی « کتاب الانواء للزجاج » ہے۔ اس لیے « الزجاج » کے بجائے « ابوالقاسم عبدالرحمنٰ بن اسحاق الزجاجی » لکھنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ بالخصوص جبکہ نلینو کی کتاب کا یہ حصہ میرے پیش نظر نہ تھا۔

ج ـــ الاخفش کے نام میں یہ عاجز کسی طرح اصلاح کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ میں تو قدیم مصنفین کا متبع ہوں۔ ابن الندیم نے « الفہرست » (مصری ایڈیشن۔ ص ۱۲۳) میں لکھا ہے : « الاخفش الصغیر : ابوالحسن علی بن سلیمان الاخفش النحوی . . . ولہ من الکتب کتاب الانواء » ابن الندیم کی تصریح پر میں کیونکر قلم اصلاح پھیر سکتا تھا۔

۹۔ ایک عجیب تعقب :

فاضل معترض نے فرمایا ہے : « یہاں یہ بات قابل ذکر ہے ہمارے فاضل نے بطور ماخذ نلینو کا ذکر تک نہیں کیا » میں نے کسی ایسے ماخذ

---

(۱) الفہرست ( مصری ایڈیشن ) ۳۸۵ : الحسن بن سہل بن نوبخت وله من الکتب ، کتاب الانواء۔

(۲) طبقات الاطباء ( ۱ : ۲۲ ) : « کتاب فی الانواء » لثابت بن قرة۔

کا ذکر کرنا جس سے استفادہ نہ کیا ہو، ادعائیت و مشیخت طرازی کے مترادف سمجھا، اس لیے نلینو کا اس مقام پر حوالہ دینے کا کوئی محل نہ تھا جہاں اس سے استفادہ کیا ہے اس کا اعتراف ضرور کیا ہے مثلاً صفحہ ۲۵ (مجلۂ علوم اسلامیہ جون ۱۹۶۱ء) سطر ۷ پر اس سے استفادے کا ذکر ہے لیکن اگر اس نکتہ چینی سے ان کی مراد سرقہ کا الزام ہے تو یہ بدگمانی قطعاً بے بنیاد ہے۔ اس قسم کی الزام تراشی سے پیشتر ذمہ دارانہ طور پر تحقیق کرلینا چاہیے تھی۔ اس قسم کے معاملات میں اتنی عجلت کرنا ذمہ داری کے منافی ہے۔

ان کی تعجیل پسندی کا یہ عالم ہے کہ فرماتے ہیں: «ان ۲۲ ناموں میں سے بہ تغیر و تبدل ہمارے فاضل مضمون نگار نے ۲۱ کا تو ذکر کیا ہے حالانکہ میں نے ۲۳ ناموں کا ذکر کیا ہے: ۲۲ کا صفحہ ٤٤ پر اور ایک (ابن قتیبہ) کا صفحہ ۲۷ پر میری فہرست میں نلینو کے مقابلہ میں کئی نام زیادہ ہیں۔

۱۰۔ ظل یا مماس:

فاضل مضمون نگار فرماتے ہیں: «عربوں کی عام متداول اصطلاح ظل اور ظل تمام کو یورپ کے تتبع میں مماس التمام سے تعبیر کیا ہے»۔

«مماس» اور «مماس التمام» کی اصطلاحیں مولوی ذکاء اللہ خاں کے زمانہ سے اردو میں متداول ہیں۔ پھر مماس (Tangent) اور مماس التمام (Cotangent) کے پیچھے ایک عملی تاریخ ہے جس کی تفصیل ریاضیات کی تواریخ میں ملیگی۔ اس کے بعد ظل کی دقیانوسی اصطلاح پر اصرار رجعت پسندی کے مترادف ہوگا۔ قرون وسطی میں ان دونوں اصطلاحوں کا جو بھی مصرف رہا ہو مگر آج یہ مصرف محض «سایہ پیمائی» نہیں ہے، بلکہ مثلث اور دائرے کے مختلف اجزاء کی نسبت کا تعین ہے۔ جس طرح قوس کو اس کے نصف وتر اور دائرے کے نصف قطر کی نسبت سے جانچا جاتا ہے جو «اُس قوس یا اُس کے بالمقابل زاویے کی جیب کہلاتی ہے»، اسی طرح دیگر اجزاء اور «نصف قطر» کی نسبت کو ناپا جاتا ہے

یہ کام «اظلال» سے نہیں چل سکتا کیونکہ اس میں نصف قطر اُصولاً داخل نہیں ہوتا۔ اس لیے اس نسبت کو دوسری کسر سے ظاہر کیا جاتا ہے جس میں نسب نما «نصف قطر» ہوتا ہے اور اس لیے شمار کنندہ دائرے کے «مماس» کا ایک محدود جز ہوتا ہے اس لیے فطرتاً اس کے لیے اصطلاح «مماس» اور اس کے ساتھی کے لیے «مماس التمام» ہوگی۔

۱۱۔۔ان العلماء یعلون و لا یُعلون:

فاضل معترض نے اس عاجز پر نکتہ چینی فرمائی ہے: «قاضی صاعد کا حوالہ دیتے ہوئے معتضد اور ثابت بن قرہ کا ہاتھ کھینچ لینے کا قصہ بیان ہوا ہے اور ان العلماء یعلون کا فقرہ معتضد کی طرف منسوب کیا ہے حالانکہ اس کے الفاظ بقول یاقوت حموی یہ ہیں «العلم یعلو ولا یعلیٰ»۔

محترم نے کچھ اس وثوق کے ساتھ یاقوت کے یہ الفاظ دہرائے ہیں گویا وہ اُس موقعہ پر موجود تھا جب معتضد باللہ نے ہاتھ جھٹکا تھا جس سے ثابت بن قرہ گھبرایا تھا اور معتضد نے اس کی تشفی کی تھی۔ جو کچھ میں نے ابن ابی اُصیبعہ سے نقل کیا ہے یا فاضل معترض نے یاقوت سے نقل کیا ہے، ماحصل دونوں کا ایک ہے بظاہر دونوں تعبیروں میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح کی کوئی داخلی وجہ نہیں ہے۔ مگر چونکہ یاقوت کا «معجم الادباء» محض ادیبوں کا تذکرہ ہے۔ دوسرے فضلاء کا ذکر اسی صورت میں آیا ہے جبکہ وہ ادیب بھی ہوتے تھے۔ اصالتاً یہ حکماء فلاسفہ کا تذکرہ نہیں ہے نیز یاقوت نے اس قصہ کی طرف ضمناً اشارہ کیا ہے، ورنہ اس کا مقصود معتضد کے حضور میں ثابت بن قرہ کی جلالت قدر کا اظہار نہ تھا، بلکہ اس قدیم واقعہ کو وہ مثال کے طور پر پیش کرتا ہے اور مثال کی جزئیات میں مطابقت واقعہ کا اس درجہ التزام ملحوظ نہیں رکھا جاتا جتنا نفس واقعہ کی روایت و حکایت میں رکھا جاتا ہے۔ اس لیے اصولی طور پر اس تذکرے کی روایت مرجح ہوگی جو حکماء و اطباء کے حالات میں مرتب کیا گیا ہوگا جس

زمرے سے ثابت بن قرہ کا تعلق تھا، اور جس میں اصل مقصود معتضد کے یہاں ثابت بن قرہ کے علومقام کا ذکر ہوگا۔

یہ تذکرہ ابن ابی أصیبعہ کا «عیون الانباء فی طبقات الاطباء» ہے مصنف نے یہ روایت براہ راست ابو اسحاق صابی سے کی ہے جو اس واقعہ کا ہم عصر ہے[1]۔

۱۲۔ ابو جعفر الخازن اور مساحت مثلث کے ضابطہ کا ثبوت :

فاضل معترض کا فرمانا ہے: «ابو جعفر الخازن کے زیر عنوان اس کی مساحت مثلث کا ذکر اس کی کتاب «مساحۃ اشکال الکریۃ والبسیطۃ» کے ضمیمہ کے حوالے سے دیا ہے۔ طوسی کے نو رسائل کے مجموعے میں راقم الحروف کو اس ضمیمہ کا پتا نہیں چل سکا»

یہ میرے اوپر بہتان ہے کہ میں نے ابو جعفر الخازن کی کوئی تصنیف «مساحۃ اشکال الکریۃ والبسیطۃ» بتائی تھی۔ میرے الفاظ حسب ذیل ہیں۔ «ابو جعفر الخازن نے معلومۃ الاصلاع مثلث کا رقبہ دریافت کرنے کے مشہور ضابطہ کا ثبوت بھی دیا تھا جسے دائرۃ المعارف حیدر آباد نے بنو موسیٰ کی «مساحۃ اشکال الکریۃ والبسیطۃ» کے ضمیمہ میں شائع کردیا ہے»۔

خدا معلوم فاضل معترض نے کس طرح «بنو موسیٰ کی مساحۃ اشکال الکریۃ والبسیطۃ» کو اس کی (ابو جعفر الخازن کی) مساحۃ اشکال الکریۃ والبسیطۃ»

(۱) وہ لکھتا ہے: «قال ابو اسحاق الصابئی الکاتب ان ثابتاً کان یمشی مع المعتضد فی الفردوس و هو بستان فی دارالخلیفة الریاضة وکان المتعضد قد اتکاءعلی ید ثابت و هما یتماشیان. ثم نترالمعتضد یده من ید ثابت بشدة ففزع ثابت فان المتعضد کان مهیباً جداً فلمانتریده من ید ثابت قال له یا اباالحسن و کان فی الخلوات یکنیه و فی الملاء یسمیه سهوت و وضعت یدی علی یدک و استندت علیها و لیس هکذا یجب ان یکون—فإن العلماء یعلون ولایعلون». طبقات الاطباء ۱ : ۲۱٦

سمجھ لیا۔ میرے معروضہ سے تو کسی طرح بھی یہ معنی نہیں نکل سکتے۔ اگر فاضل معترض نے «رسائل طوسی» کا اطمینان سے مطالعہ کیا ہوتا تو اُنھیں یہ ضمیمہ ضرور مل جاتا «رسائل طوسی» (جلد ثانی) کا پہلا ہی رسالہ بنو موسیٰ کی «مساحۃ اشکال الکریہ والبسیطہ» ہے۔

۱۲—ابو نصر بن عراق اور ابو جعفر الخازن:

فاضل معترض نے فرمایا ہے: «کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ فاضل مضمون نگار نے ابو نصر منصور بن علی بن عراق . . . کی ابو جعفر الخازن کے متعلق اپنی اس رائے کا اظہار کس بنا پر نہیں کیا . . . یہ عبارت کیوں حذف کردی . . . یہ سراسر فضلا کے طریق روایت اور دیانت کے خلاف ہے»۔

مجھے افسوس ہے کہ فاضل نکتہ چیں موضوع زیر بحث کو بھی فراموش کرگئے۔ موضوع زیر بحث «ابوجعفر الخازن کا تنقیدی مطالعہ» نہ تھا بلکہ «البیرونی سے پہلے علم المثلثات کا ارتقا» تھا اور اس مختصر جائزے میں صرف عظماء فن اور ان کی عظمت کو بیان کرنا مقصود تھا۔ اگر محض ابو جعفر الخازن کی علمی کاوشوں کا جائزہ لیا گیا ہوتا اور اس میں اس کے «ماله» کے ساتھ اس کے «ماعلیہ» کا ذکر نہ ہوتا تو اسے ایک ناقص تذکرہ کہہ سکتے تھے یا اسے بددیانتی بتاسکتے تھے۔

پھر میرے مقالہ کا اصل مقصد علم المثلثات کے اندر اس کے مختلف ماہرین کی کاوشوں کا تذکرہ تھا اگر ان کاوشوں کو ان کے دریافت کنندگان کے بجائے کسی دوسرے کی جانب منسوب کردیا جاتا تو بےشک راقم پر بددیانتی کا الزام صحیح ہوتا کیوں کہ اس سے اصل موضوع کے ارتقا کا غلط نقشہ سامنے آتا ہے۔ لیکن اگر کسی معاصر نے دوسرے معاصر پر حریفانہ چوٹیں کی ہیں تو اُن کے ترک ذکر سے اصل موضوع کے ارتقا پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ بددیانتی اس وقت ہوتی ہے جبکہ کسی عبارت کے ضروری حصوں کے حذف سے مطلب کچھ کا کچھ ہوجائے۔ اس کی مثال اٹھارویں اعتراض میں آرہی ہے۔

۱٤—تمہید المستقر فی معانی الممر :

جناب معترض نے فرمایا ہے : « یہاں فاضل مضمون نگار سے لغزش ہوگئی ہے کہ انہوں نے البیرونی کی کتاب کا نام «تمہیدالمستقرفی معانی الممر» بتایا ہے حالانکہ صحیح نام «تمہیدالمستقر لتحقیق معنی الممر » ہے ۔

مجھے ایسی لغزشوں کا جناب معترض کی نشاندہی سے پہلے ہی اعتراف ہے مگر الفاظ کے بیجا اسراف سے پہلے اُنہیں مسئلہ کی اہمیت کو متحقق کرلینا تھا ۔ کیا ان دونوں میں اتنا بڑا فرق ہے کہ ان کے موضوع کے متعلق قاری کو غلط فہمی ہونے کا اندیشہ ہے ؟ یقیناً نہیں، کیونکہ «ممر» ہو یا اور کوئی لفظ اس کے «معنی کی تحقیق» کے لیے اس کے مروجہ «معانی» کا ذکر ضروری ہے ۔ اسی طرح کسی لفظ کے متعدد «معانی» میں سے اُس کے حقیقی مصداق کے تعین کے لیے اس کے «معنی» کی تحقیق بھی ضروری ہے ۔ یہ ایک سیدھی سادی بات ہے جس کے لیے دوسرے کو لغزش کا مرتکب بتانا الفاظ کا بیجا استعمال ہے ۔

بہر حال جناب قریشی صاحب کا تکیہ اس باب میں زخاؤ پر ہے ۔ اس نے «الآثارالباقیہ» کے مقدمہ میں البیرونی کا وہ خط نقل کیا ہے جس میں اس نے سنہ ٤٢٧ھ میں اپنے کسی دوست کو اپنی کتابوں کی تفصیل لکھکر بھیجی تھی ۔ ان میں سے ایک کتاب کا نام زخاؤ نے «تمہید المستقر لتحقیق معنی الممر» لکھا ہے جو تقریباً ٦٠ ورق پر مشتمل تھی خدا جانے یہ خط کتنے واسطوں سے نقل ہوتا ہوا اس شکل میں آیا ہے جو زخاؤ کو ملا اور چونکہ روایت بالمعنی حدیث تک میں شائع تھی تو خدا ہی جانے کن کن کاتبوں نے اس «خط» میں کیا کیا جائز و ناجائز تصرفات کیے اور پھر زخاؤ بھی تو «معصوم عن الخطأ» نہیں ہے آخر علی بن رَبن (براے مہملہ) الطبری کو بھی تو اس نے علی بن زین (بزائے ہوز و بائے حطی) پڑھا ہے ، اور بھی اس سے تسامحات ہوئے ہیں (جن کی تفصیل آگے آرہی ہے) . سخاؤ کا یہ کارنامہ ہی کیا کم ہے کہ اس کی اعتنا سے «الآثار الباقیہ» اور «کتاب الہند» جیسی اہم کتابیں چھپ کر عام دسترس

میں آگئیں۔ اس سے زیادہ کی اس سے توقع خوش فہمی ہے۔ « تمہید المستقر » دنیا سے ناپید نہیں ہے، اس کا (غالباً) واحد نسخہ اورینٹل پبلک لائبریری بانکی پور میں موجود ہے۔

بعد میں اس رسالہ کو البیرونی کے دوسرے رسالوں کے ساتھ « مجموعۂ رسائل البیرونی » کے نام سے دائرۃ المعارف حیدرآباد نے شائع کردیا ہے۔ اپریل ۱۹۹۰ کے « اسلامک کلچر » میں اس مجموعہ پر تبصرہ شائع ہوا ہے۔ اس میں بھی اس رسالہ کا نام « تمہید المستقرفی معانی الممر » ہے۔ پھر اس کا افتتاح جس انداز میں ہوتا ہے اس سے بھی اس کا نام « تمہید المستقر فی معانی الممر » ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال یہ رسالہ میرے پیش نظر تھا۔

لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ سیاق و سباق میں کہیں میری معروض سے یہ مترشح نہیں ہوتا کہ میں زخاؤ کے نقل کیے ہوئے البیرونی کے خط سے اس کی اس کتاب کا نام دے رہا ہوں۔ اس صورت میں میرا یہ تسامح بیشک « لغزش » کہلانے کا مستحق تھا۔ میں دائرۃ المعارف حیدر آباد سے شائع شدہ ایک کتاب سے[1] کوشیار کے ذکر کا حوالہ دے رہا ہوں کیا میرا یہ فرض نہ تھا کہ اس کے سرورق پر جو اس کا عنوانِ تحریر ہے، اُسے بعینہ نقل کردوں۔ یا مجھے یہ حق تھا کہ اس عنوان میں حسب دلخواہ تصرف کرلوں۔ عالم یہ ہے کہ صحیح نام لکھنے پر تو محققین عظام اُسے کچھ کا کچھ پڑھ ڈالتے ہیں جیسا کہ بنو موسیٰ کی « مساحۃ اشکال الکریۃ والبسیطۃ » کی گت بنی۔ اگر میں ہی اس میں غلط یا صحیح تصرف کر دیتا تو صحت نقل کی ذمہداری سے قطع نظر، اس کی افادیت کا حشر معلوم!

۱۵۔ البیرونی اور گردشِ ارضی کا نظریہ:

فاضل معترض فرماتے ہیں: « انہوں نے ترجمہ ایسی خوبی سے پیش کیا ہے کہ سماء کی حرکت کلی کو بیرونی کے نزدیک در حقیقت زمین کی حرکت تسلیم کیا ہے حالانکہ وہ اسے شبہ کی نگاہ سے دیکھتا ہے »۔

---

(۱) مجموعۂ رسائل البیرونی شائع کردہ دائرۃ المعارف حیدرآباد ۱۹۴۸ء: تیسرا رسالہ بعنوانِ « تمہید المستقر فی معانی الممر »۔

کیا اچھا ہوتا اگر قریشی صاحب اس مقام کی نشاندھی فرما دیتے جہاں مجھ سے ترجمہ میں «لغزش» ہوئی ہے. خود انھوں نے «استیعاب الوجوہ الممکنہ» کی جو اصل عربی عبارت پیش کی ہے وہ میری معروض کی موید ہے. البیرونی کہتا ہے میں نے اس اصطرلاب کو بیحد پسند کیا: «فاستحسنتہ جداً». سوال یہ ہے اس «استحسان» کی وجہ کیا تھی؟ یقیناً یہ اسکی کاریگری یا ندرت یا حسن اتقان نہیں تھے جنھوں نے البیرونی کو اپنی طرف متوجہ کیا ہو، بلکہ اسکی ساخت کا بنیادی اصول تھا (جو اس زمانہ میں اور اس سے پہلے بھی بعض لوگوں کا عقیدہ رہا تھا) کہ حرکت کلیہ زمین کی گردش سے پیدا ہوتی ہے نہ کہ آسمان کی:

«فاستحسنتہ جداً لاختراعہ علی اصل قائم بذاتہ مستخرج عمایعتقدہ بعض الناس من ان الحرکة المرئیة الشرقیة ھی للارض دون الفلک».

اب «گردش ارضی کے عقیدے کے اصل قائم کے استحسان» کا مطلب اگر «تسلیم» نہیں ہوسکتا تو کیا ہوگا؟ اور اگر وہ کسی وجہ سے بھی اس قلبی اذعان اور «تسلیم» کا کھل کر اظہار نہیں کرسکتا تو یقیناً وہ اسے عسیرالانحلال شبہہ «شبھة عسرةالتحلیل» سے تعبیر کرے گا.

اس معذرت کو کماحقہ گوش گزار کرنے کے لیے اس عہد کی علمی اور فکری تحریکات پر ایک مختصر یادداشت پیش کرنا مستحسن معلوم ہوتا ہے.

مسلمانوں کے یہاں علم الھیئت کے جو اصولی مسلمات مروج تھے، وہ بیشتر حالات میں یونانیوں سے ماخوذ تھے. یونانی ھیئت دانوں میں زمین کا سکون اور اس کا مرکز عالم میں واقع ہونا، نیز افلاک کلیہ و جزئیہ کا اسکے گرد حرکت کرنا مسلمات فن میں سے تھا. فیثاغورث اور اس کے متبعین مثلاً فلولاؤس (Philolaus) ھکیٹاس (Hicetas) ھیراکلیٹس (Heractilus) اور ایکفانٹس (*Ecphantus*) البتہ اس بات کے قائل تھے کہ زمین (مع دیگر سیارات کے اپنے محور پر گردش کرنے کے ساتھ ساتھ کسی «مرکزی آگ» کے گرد بھی حرکت کرتی ہے. لیکن فیثاغورثیوں کا یہ ھیئتی

عقیدہ ان کے عرفانی فلسفہ اور سرّی تعلیمات کا ایک جزو تھا اور اپنے اسطوری انداز فکر کی بنا پر کسی طرح بھی عہد حاضر کے کوپرنیکی شمس مرکزی نظریہ کی اصل نہیں کہا جاسکتا ۔

بہرحال فیثاغورثیوں کا ہیئتی عقیدہ عام یونانی فکر کو متاثر نہ کرسکا اور غیر فیثاغورثی فلاسفہ اور ہیئت‌دان زمین کو ساکن اور ثوابت و سیارات کو اس کے گرد متحرک مانتے رہے ۔ ان مفکرین میں سب سے اہم ارسطو ہے ، جسکے نظام فکر نے جلد ہی دوسرے افکار و تصورات کو جنس کاسد بناکر گوشۂ گمنامی میں ڈالدیا اور جو صدیوں تک نہ صرف یونان بلکہ مسلمانوں اور قرون وسطیٰ کے یورپ میں بھی نیم مذہبی تقدس و مقبولیت کا حامل رہا ۔

ارسطو کی وفات کے بعد فکری قیادت کا شرف یونان سے مصر میں منتقل ہوگیا ، یہاں اسکندریہ کے اہل علم نے بطالمہ کی زیرسرپرستی اور ان کے بعد رومن قیاصرہ کے عہد حکومت میں یونانی بالخصوص ارسطا طالیسی روایات و تعلیمات کو جاری رکھا ۔ اُپلونیوس نے افلاطون ، ایوڈوکس ، کالتپس اور ارسطو کے ہم مرکز کرات کے نظریہ کو مسترد کرکے اجرام فلکی کی گردش کو خوارج ( Ecentrics ) اور تداویر ( Epicycles ) کی پیچیدہ گردش کے نظریہ میں بدل دیا ۔ مگر بنیادی اصول و مسلمات میں ارسطو کی « کتاب السماء والعالم » کی تعلیمات کو نوشتۂ مذہبی جیسی اہمیت حاصل رہی اور زمین کا مرکز عالم میں واقع ہونا اور ثوابت وسیار کا اس کے گرد حرکت کرنا غیر متنازع فیہ بنا رہا ۔ البتہ ارسطرخس ( Aristarchus ) تیسری صدی قبل مسیح میں اور سلوقیہ کا سلیوکس (Selencus) دوسری صدی قبل مسیح کے وسط میں اس رائے کے اندر منفرد تھے کہ سورج دیگر ثوابت کی طرح ساکن ہے اور زمین اپنے محور پر گردش کے ساتھ ساتھ سورج کے گرد بھی حرکت کرتی ہے ۔ مگر ان کا یہ نظریہ ارسطاطالیسی « ارض۔ مرکزیت » کے مروجہ عقیدہ کے مقابلے میں صدا بہ صحرا سے زیادہ موثر ثابت نہیں ہوا ۔ بطلیموس جو یونانی ہیئت‌دانوں کا امام ہے اور جس کی کتاب

«المجسطی» نه صرف یونانی ہیئت کا شاہکار ہے بلکہ علم الہیئت کی ادبیات عالیہ میں بھی نمایاں مقام رکھتی ہے ، اسی «ارض مرکزی نظریہ» کا قائل تھا . چنانچہ «المجسطی» کے پہلے مقالہ میں زمین کی مرکزیت اور اسکے سکون کو مسلمات فن میں محسوب کرتا ہے. بطلیموس ، ارسطرفس اور اسکے انداز پر سوچنے والے حکماء کے «نظریۂ گردش ارض» سے بھی واقف تھا اور «المجسطی» میں اس کا ذکر بھی کرتا ہے :

«و قد ظن قوم ان الارض متحركة بالاستدارة حول المحور الحركة اليومية من المغرب الى المشرق» .

لیکن خود سکون ارض اور ارض مرکزی نظریہ کا علمبردار تھا . یہی ارض مرکزی نظریہ یونانی ہیئت کے ساتھ مسلمانوں میں منتقل ہوتا رہا اور چوتھی صدی تک مسلمان ہیئت دانوں کا معمول بہ بنا رہا . مگر چوتھی صدی ہجری میں جب ہیئت کے ساتھ اعتنا بہت بڑھ گیا اور ماہرین فن نے متداول نظریات و نتائج کے علاوہ نئے نئے تجربات و تصورات پر بھی توجہ کی تو کچھ طبیعتیں خود کو ارسطو اور بطلیموس کی کورانہ تقلید پر راضی نہ رکھ سکیں اور مروجہ افکار و تصورات سے بغاوت پر مجبور ہوئیں . ان میں احمد بن عبدالجلیل السجزی پیش پیش تھا . اس نے اپنے «اصطرلاب زورقی» کو اسی «شمس مرکزی نظریہ» کے اصول پر بنایا تھا . چنانچہ البیرونی لکھتا ہے :

«و قد رايت لابى سعيد السجزى اصطرلاباً . . . سماه الزورقي فاستحسنته جداً لاختراعه اياه على اصل قائم بذاته مستخرج مما يعتقده بعض الناس ان الحركة الكلية المرئية الشرقية للارض دون الفلك» . (استیعاب الوجوه الممكنه بحواله قانون مسعودی مقدمہ انگریزی) اسی «استحسان» کی وجہ سے خیال کیا جاتا ہے کہ البیرونی خود اس «شمس مرکزی نظریہ» کی جانب رجحان رکھتا تھا . میں نے تو اپنے مضمون میں اس کی صراحت نہیں کی تھی مگر عام محققین یورپ کا یہی خیال ہے چنانچہ سارٹن نے اپنی «تعارف تاریخ سائنس» میں اس کے بارے میں یہی لکھا ہے .

سارٹن ھی پر اعتماد کرکے بعد کے لوگوں نے اس بات کو البیرونی کی طرف منسوب کیا چنانچہ پرنسپل عبدالرحمن خاں مرحوم نے کتاب کا جو ملخص ترجمہ کیا ہے اس میں فرماتے ھیں[1]:

«اس مسئلے پر بھی اس نے بحث کی ھے کہ آیا زمین خود اپنے محور پر گھومتی ھے یا اس کے گرد آسمان چکر لگاتا ھے لیکن قطعی معلومات کے فقدان کی وجہ سے کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا[2]».

یہی نہیں بلکہ چوتھی صدی ھجری کے وسط میں (جیسا کہ البیرونی کے الفاظ «مایعتقدہ بعض الناس» سے ظاھر ھے) یہ ایک معرکۃ الآرا مسئلہ تھا. اس لیے البیرونی کا اپنی جوانی کے زمانہ میں اس باغیانہ نظریے کی طرف مائل ھوجانا فطری تھا جس طرح وہ ابوبکر زکریا الرازی کے ملحدانہ افکار کا اسی زمانہ میں اور اس کی کتابوں کا جویا تھا اور اس کے نتیجہ میں مانویت میں دلچسپی رکھتا تھا (اگرچہ آخر میں یعنی ۴۲۷ھ کے قریب وہ دونوں سے بیزار ھوگیا)[3]. بہر حال اس نے اپنے استاد ابو نصر بن عراق سے اس اہم مسئلہ کی وضاحت کی درخواست کی اور مؤخرالذکر نے

---

(۱) قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات ۱ : ۱۸۲

(۲) انہوں نے «البیرونی کی یادگار جلد» میں جو مقالہ لکھا تھا، اس میں تحریر کیا ھے:

"He discussed the question of the earth's rotation on its axis but failed to reach a definit conclusion, possibly for want of adequate scientific data." (*Al-Beruni's Commemoration volume*, p. 172)

اسی طرح سید ابوالکاظم استاذ شعبۂ ریاضیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اسی یادگار جلد میں لکھتے ھیں:

"The great astronomer was the first to observe and solemnly assert that assumption that the earth moves round the Sun could not be disproved the explanation of which was later given by Copernicus, (1473—1543) in his helio—centric Theory." (*Ibid* p. 170)

(۳) «وانا مع برأتی من اتباعه (اتباع ابی بکر الرازی) فیما یفسد... ثم اختصرت ما فی تلک السفر (سفر الاسرار) من الهذیان البحت والهجر المحض لیطلع علیها مألوف بآفتی... ولست اعتقد فیه مخادعة بل انخداعاً» (مکتوب البیرونی مورخہ ۴۲۷ھ در مقدمۂ الآثار الباقیہ ص XXXIX)

اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ بعنوان «رسالة فی کریة السماء» لکھ کر اسے بھیجا۔ ابو نصر بن عراق نے اس رسالہ میں متداول ارسطاطالیسی بطلیموسی نظام ہیئت کی مدافعت کے ساتھ ساتھ اس خیال کی بھی تردید کی تھی کہ اجرام فلکی بیضوی مدارات میں گردش کرتے ہیں:

«فظاهران حركات الشمس و القمر على مدارات كرية و لازم متى كان ذلك ظاهرا فى حركات النيرين ان يكون كذلك فى حركات سائر الكواكب المتحيرة بذلك البرهان... ولو ان قائلا قال: فلعل حركات سائرالمتحيرة على قطوع ناقصة... فبعكس مايقوله الناس اذ لوكانت حركتها على قطوع ناقصة ويتصور من ذات نفسه غيرما يدرك وليس فى يده حجة ولا برهان ولاسبب الى ادخال الشبهة»

البیرونی کا ایک نامور معاصر ابو سہل عیسی بن یحیی المسیحی تھا۔ اس نے البیرونی کے لیے تقریباً بارہ کتابیں لکھی تھیں ان میں سے ایک کا نام «کتاب فی سکون الارض أوحرکتها» تھا، جو اسی موضوع پر تھی۔

غالباً چوتھی صدی کے آخری عشرے میں جرجانیۂ خوارزم کے علمی حلقوں میں بھی یہ مسئلہ رونق ہنگامۂ محفل بنا ہوا تھا اور وزیر ابوالحسن احمد بن محمد السہلی کے یہاں اس پر گرما گرمی رہا کرتی تھی۔ چنانچہ البیرونی کے حریف شیخ بوعلی سینا نے بھی اس موضوع پر ایک رسالہ ابوالحسن سہلی کے واسطے لکھا تھا جس کا عنوان ہے: «کتاب قیام الارض فی وسط السماء الفه لابی الحسین احمد بن محمد السہلی» یہ رسالہ مصر کے ایک فاضل نے شیخ کے کچھ اور رسائل نیز خیام کے تین رسالوں کے ساتھ ایک مجموعہ میں «جامع البدائع» کے عنوان سے شائع کردیا ہے۔ اس کی نویں فصل میں اس نے اپنی اس رائے کی توضیح کی ہے۔ اس کے بعد دسویں فصل میں اس مسئلہ میں جو مختلف مفکرین کی رائیں ہیں ان پر تبصرہ کیا ہے۔

غرض «استیعاب الوجوہ الممکنہ» ۳۹۱ ھ سے قبل کی تصنیف ہے کیونکہ البیرونی «الآثار الباقیہ» میں (جسے اُس نے اس سن کے قریب لکھا تھا) اس کا حوالہ دیتا ہے اور یہ اس کی جوانی کا زمانہ ہے جبکہ

هر حوصله مند طالب علم متداول نظریات سے منحرف اور نئے تصورات کی طرف مائل ہوا کرتا ہے۔ اس لیے ۳۹۰ ھ سے قبل اس کے لیے «شمس مرکزی نظریہ» کا استحسان اور اس کی طرف میلان فطری تھا، جس طرح وہ ابوبکر زکریا رازی کی تصانیف میں دلچسپی لیتا تھا اور مانویت کی طرف شوق رکھتا تھا۔ مگر وہ رائے عامه کے دباؤ سے جو «ارض مرکزی نظریہ» کی قائل تھی کھل کر اپنے فطری میلان کا اظہار نہیں کرتا اور صرف «شبہه عسرة التحليل صعبة المحق» سے اس کی اهمیت اور اس کے مستحق اعتنا ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

مگر بعد میں اسے اپنے خیال پر نظر ثانی کرنا پڑی۔ اس میں زیادہ مؤثر اس کے اُستاد ابو نصر بن عراق کا «رسالة في كرية السماء» تھا۔ ممکن ہے اس کے حریف (شیخ بو علی سینا) کا استدلال بھی یہی رہا ہو۔ اس نے اس مسئله کے ماله و ماعلیه پر محققانه نظر ڈالی اور ایک مستقل رساله لکھا جس کا «کتاب الهند» میں حواله دیا ہے اور لکھا ہے: «اس مسئله کا حل کرنا بڑا مشکل ہے۔ قدیم اور جدید مشاهیر هیئت دانوں نے گردش ارضی کے مسئله کا بڑا عمیق مطالعه کیا ہے اور اسے باطل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہم نے بھی اس موضوع پر ایک رساله بعنوان «مفتاح علم الهيئة» لکھا ہے۔ جس کے متعلق ہمارا خیال ہے که ہم نے قدماء کی کاوشوں پر معتد به اضافه کیا ہے[1]»۔

یہ ٤۲۷ ھ سے قبل کی بات ہے کیونکہ «کتاب الهند» اس سن سے پہلے مکمل ہوچکی تھی۔ مگر آخر میں (یعنی ٤۲۷ ھ کے بعد) وہ اسی قطعی نتیجه پر پہنچا جو عام مسلمان هئیت دانوں کا متفق علیه ہے یعنی زمین کا مرکز عالم میں واقع اور ساکن ہونا۔ چنانچه «قانون مسعودی» (مقاله اول۔ باب اول۔ فصل خامس) میں لکھتا ہے[2]:

«فليعلم الآن ان الارض لوكانت متحركة كما ذكرنا لكان

---

(۱) کتاب الهند : ۱۳۹ (۲) قانون ۱ : ۵۲ ـ ۵۳

ما ذکرنا . . . ولیس من ذلک شیئ موجود فلیس للارض فی مکانها
حرکة دوریة حول مرکزها » .

یہی نہیں بلکہ اُس نے اپنے سابق « تذبذب » کی دلیل سے بھی رجوع کرلیا کہ یہ مسئلہ ریاضیات سے حل نہیں ہوسکتا کیونکہ اس نے گردش ارضی کے ابطال میں ایک ریاضیاتی دلیل بھی دی ہے[1] :

« و اما النظر التعلیمی فی هذا المعنی فان القول فیه راجع الی ان الارض لوکانت متحرکة بهذه الحرکة لتخلف عنها ماانحاز منها من طائر محلق اوشیئ مرمی به نحو جو السماء . . . فتری حرکتها نحو المغرب دائماً . . . لکنا نراها متحرکة فی جمیع الجهات ثابت و لا هی متحرکة هذه الحرکة التی بهاالليل والنهار » .

البیرونی «قانون مسعودی» میں بھی ابو سعید السجزی کے « شمس مرکزی نظریہ » سے تعرض کرتا ہے ۔ مگر «استیعاب الوجوہ الممکنہ » کی طرح اب اس کا نام نہیں لیتا بلکہ بانداز تعریض اس کی رائے کی طرف اشارہ کرتا ہے جس سے ظاہر ہے کہ اب وہ اس رائے کو ضعیف و مرجوح سمجھتا ہے ۔ وہ ابو سعید السجزی کی رائے کی مزید تضعیف کے لیے یہ بھی بتاتا ہے کہ السجزی طبیعیات کے عام اصول کے خلاف یہ عقیدہ رکھتا تھا کہ اجسام ثقیلہ عموداً زمین پر نہیں گرتے[1] .

بہرحال سارٹن وغیرہ کا یہ خیال غلط ہے کہ وہ کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکا تھا ۔ کیونکہ «کتاب الهند » میں وہ اپنے ایک رسالے کا ذکر کرتا ہے ( حوالہ پیچھے گزرا ) جس میں اس مسئلے میں اس نے اپنی مستقل رائے کا اظہار کیا ہے اور آخر عمر میں تو « قانون مسعودی » میں جو الموں کے ہیئتی افکار کی مستند قاموس ہے ، اسی نتیجہ پر پہنچا تھا جو علم مسلمان ہیئت دانوں کا متفق علیہ ہے لیکن اتنا یقینی ہے کہ وہ اپنے عہد جوانی میں « گردش ارضی » کے نظریہ کو بنظر استحسان دیکھتا تھا ۔

---

(۲) قانون ۱ : ۵۰

اب اس استحسان کو چاہیے «تسلیم» سمجھا جائے یا نہ سمجھا جائے (اور نہ سمجھنے کی کوئی وجہ بھی نہیں ہے) یہ امر میرے موضوع سے سے خارج تھا. مجھے اصولی طور پر ابو سعید السجزی کے منفردات کو گناتا تھا. اس لیے میں نے «استیعاب الوجوه الممکنة» کے اتنے ہی حصہ کا ترجمہ کیا (جو غالباً غلط نہیں ہے) جو ابوسعید السجزی کے عقیدے سے متعلق تھا. البیرونی کے نظریات کا یہ محل نہ تھا لہذا اس کے «شبهة عسرة التحلیل صعب المحق» کی وضاحت سے تعرض کی کوئی ضرورت نہ تھی. ایک بات ضرور ہے ہرچند البیرونی آخر عمر میں «ارض مرکزی نظریہ» ہی کا قائل اور علمبردار ہوگیا تھا. مگر اس کے عہد جوانی کے «شبهة عسرة التحلیل صعب المحق» نے بعد کے مسلم ہیئت دانوں کی تحکمیت (Dogmatism) کی تعدیل کردی. چنانچہ ہرچند کہ وہ راجہ جے سنگھ سوائی (زیج محمد شاہی) کے زمانہ تک «ارض مرکزی نظریہ» ہی کے قائل تھے لیکن حرکت ارضی کا محکمانہ انکار بھی نہیں کرتے تھے. چنانچہ شیخ بهاء الدین عاملی نے «تشریح الأفلاک» میں لکھا ہے: «ولم یقم دلیل علی بطلان تحرکہا حرکة وضحیة» اور ان کے شارحین نے اس قول سے اختلاف کی کوئی وجہ نہیں پائی، بلکہ وہ اسی کی توضیح کرتے رہے اگرچہ یہ عدم انکار انہیں کبھی جدید «کو پر نیکی نظام کائنات» سے قریب نہ لاسکا.

١٦ــصغانی اور صاغانی:

فاضل معترض کا فرمانا ہے: «ابوحامد الصغانی (نہ کہ الصاغانی)». اگر فاضل معترض نے «تحدیدنهایات الأماکن» کے مخطوطہ کے علاوہ اور کتابوں کے ساتھ بھی اعتنا کیا ہوتا تو اس نکتہ چینی کی زحمت نہ فرمانا پڑتی. ابوحامد کے متعلق تحقیقی طور پر یہ معلوم نہیں کہ وہ «چاغان» کا رہنے والا تھا یا چغانیاں کا: «چاغان» یا «چاغان کوه» مرو کے نزدیک ایک گاؤں ہے جسے عربی میں «صاغان» کہتے ہیں[1]. «چغانیان» ماوراءالنہر کی ایک وسیع

(١) یاقوت: البلدان ٥ : ٣٣٢

ولایت تھی جسے عربی میں «صغانیان» کہتے تھے۔ نسبت اس (صغانیان) سے «صغانی» اور «صاغانی» دونوں آتی ہیں۔ چنانچہ یاقوت لکھتا ہے[1]:

«صغانیان . . . یبدلون الصاد فیقولون چغانیان : ولایة عظیمة بما وراء النهر متصله بترمذ . . وقد نسبوا الیها علی لفظین صغانی و صاغانی . منهم ابوبکر محمد بن اسحاق بن جعفر الصغانی . . . و عرف بالصاغانی ابوالعباس الفضل بن العباس بن یحیی الصاغانی ، له تصانیف فی کل فن و تصنیفه فی الحدیث احسن منها»

اسی طرح سمعانی جن کی «کتاب الأنساب» ان نسبتوں کے باب میں معتمد علیہ مأخذ ہے، لکھتے ہیں:

«الصاغانی . . . هذه النسبة الی صاغان . . . قریة بمرو . . . و قد ینسب ابوبکر محمد بن اسحاق الصغانی فیقال له الصاغانی ایضاً و هو منسوب الی صغانیان . . . قال المعدنی ابوالعباس احمد بن عمران هو عم ابی علی الصاغانی الحنفی من اصل الصغانیان»

آگے چل کر «الصغانی» کے عنوان میں لکھتے ہیں:

«الصغانی هذه النسبة الی بلاد مجتمعة وراء نهر جیحون یقال چغانیان و تعرب فیقال له الصغانیان . . . والنسبة الیها الصغانی والصاغانی ایضاً و المشهور بهذه النسبة ابوبکر محمد بن اسحاق بن جعفر الصغانی . . . و ابوسعد محمد بن میسر الصغانی الضریر و یقال له الصاغانی ایضاً . . . و ابو الفضل عباس بن جعفر الصاغانی شیخ حدث بسمرقند».

غرض صغانیان کے باشندے دونوں نسبتوں سے منسوب ہوتے تھے۔ بلکہ ایک ہی شخص دونوں نسبتوں سے پکارا جاتا تھا۔ اس لیے ابو حامد خواہ چاغان (صاغان) کا باشندہ ہو یا چغانیان (صغانیان) کا اس کی وطنی نسبت دونوں طرح لکھی جاسکتی ہے اور کسی کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ غلط ہے اور اس کے بجائے یہ صحیح ہے۔

(۱) یاقوت : معجم البلدان ۵ : ۳۶۱-۳۶۲

یہ بھی واضح رہے کہ ابو حامد کے بہت سے ہمعصر شعراء و ادباء «صاغانی» نسبت ہی رکھتے تھے اور اسی املاء سے ثعالبی جیسے ادیب نے «یتیمة الدہر» میں ان کی نسبت لکھی ہے، مثلاً ابوعلی الصاغانی[1]، ابو العباس الصاغانی[2] وغیرھما. پھر بھی یہ املاء میں نے محض جدت طرازی کی بنا پر اختیار نہیں کیا. صحت نقل و روایت کا التزام اس کا مقتضی تھا. میں نے ابو حامد کا تذکرہ ابن القفطی کی کتاب[3] سے نقل کیا تھا اور اس نے صاحب ترجمہ کا نام «ابو حامد الصاغانی» ہی دیا ہے.

لیکن جتنا تذکرہ البیرونی سے منقول ہے، اس میں اسی صحت نقل کے التزام کے پش نظر «ابو حامد الصغانی» (بغیر الف) تحریر کیا ہے، کیونکہ البیرونی نے اس کی نسبت «صغانی» ہی دی ہے.

١٧—مدة کی سہل القرآة تصحیف:

فاضل معترض لکھتے: «میں فاضل مضمون نگار کی ان دو «لاتوں» کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہا ہوں الاماشاءاللہ ان کا اس سے مطلب شمس کی دوران ربیع کی دوڑ جست یا زقند سے ہو» یہ لفظ «لات» نہیں ہے بلکہ «مدت» ہے جو مجلۂ علوم اسلامیہ جون ١٩٦١ (ص ٥١ سطر ١، ٢٢) میں کمپوزیٹر کی غلطی سے «ربع شرقی کی لات» چھپ گیا ہے[4].

١٨—ابو نصر بن عراق کی کتاب السموٰت پر ابوالوفا کا تبصرہ:

فاضل معترض کا فرمانا ہے: «فرماتے ہیں جب یہ کتاب (کتاب السموت) ابوالوفا کے پاس پہنچی تو وہ اس دریافت سے مطمئن نہ ہوا اور اسے زیادہ قابل استحسان نہ گردانا. اس کے بالمقابل بیرونی کی یہ عبارت پڑھیے: ورد جوابه ماظننا باستحسانه الكتاب واستعظامه إياه».

(اور اس کا جو جواب آیا اور جو ہم سمجھ سکے یہ تھا کہ اس نے اس کتاب کی بڑی تعریف کی اور اسے ایک بہت بڑا کارنامہ قرار دیا

---

(١) یتیمة الدہر ٤ : ١٣—٣٩ (٢) یتیمة الدہر ٤ : ٣٠
(٣) أخبار الحکماء ٥٦ ، ٥٧ ، ٢٣١
(٤) قانون مسعودی ١ : ٣٦٤ ، ٢ : ٦٥٩ ، ٦٦٠

(الف) میں نے خود ابو نصر بن عراق کے اپنے خیال کا ترجمہ کیا تھا.
ابو نصر بن عراق کے اصل الفاظ اس کے «رسالة فی معرفة القسی الفلکیه بعضها من بعض بطریق غیر معرفتها بالشکل القطاع» ص ۲ میں حسب ذیل ہیں:

«ورد کتاب شیخنا أبی‌الوفا محمد بن محمد البوزجانی علی الفقیه أبی علی الحبوبی یذکر فیه انه تامل اکثر کتابی فی السموات فوجدنی فیه سالکا مسلک المتقدمین یشیر الی عملی فی براهینه بالشکل القطاع ویصیف ان طرقه التی سلکها فی المجسطی الذی عمله اخف واسهل واوجز و احسن».

جب ایک شخص دوسرے کی کاوش کو متقدمین کی کاوش کا اعادہ (بالفاظ دیگر جدت سے خالی) بتاتا ہے اور اس کے مقابلے میں اپنی کاوش کو آسان، مختصر اور زیادہ بہتر کہتا ہے تو اس کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ اول الذکر کی «دریافت سے مطمئن نہیں ہے اور اسے زیادہ قابل استحسان نہیں گردانتا».

(ب) فاصل معترض نے «مقالید علم الهیئة» کی پوری عبارت نقل نہیں کی ورنہ البیرونی نے بھی وہی کہا ہے جو میں نے ابو نصر بن عراق کی عبارت سے سمجھا ہے. ابو نصر کی «معرفة القسی الفلکیه» کی عبارت اوپر مذکور ہوئی. «مقالید علم الهیئة» کی عبارت حسب ذیل ہے:

«ورد جوابه مما ظنا (ناطقاً) باستحسان الکتاب و استعظامه ایاه لولا ان صاحبه سلک فیه طریق القدماء فی استعمالهم الشکل القطاع والنسبة المؤلفة فان له طرقاً خفیة فی معرفة السمت اوجز من ذلک و احسن».

ابو نصر نے لکھا تھا کہ ابو الوفا نے مجھے قدماء کے طریقہ پر گامزن پایا (سالکا مسلک المتقدمین) کیونکہ ان کی طرح مجھے بھی شکل قطاع کو استعمال کرتے پایا اور البیرونی بھی یہی کہتا ہے کہ ابوالوفا نے ابو نصر پر نکتہ چینی کی تھی کہ اس نے شکل قطاع اور نسبت مؤلفہ کے استعمال میں قدماء کی روش کی جادہ پیمائی کی ہے (سلک طریق القدماء)

ابو نصر نے لکھا تھا کہ ابوالوفا اپنے طریقہ کو (جسے اس نے اپنے مجسطی کے ایڈیشن میں استعمال کیا ہے) زیادہ آسان، مختصر اور بہتر سمجھتا ہے. البیرونی نے بھی لکھا ہے کہ ابوالوفا «معرفت سموت» میں اپنے طریقہ کو زیادہ مختصر اور بہتر سمجھتا ہے.

(ج) البتہ انہوں نے «ما ظننا باستحسانه الكتاب و استعظامه اياه». کے بعد «لولا ان صاحبه سلک فيه طريق القدماء . . . فان له طرقاً . . . اوجز من ذلک و احسن». کو حذف کرکے علمی ذمہ داری اور دیانتدارانہ تنقید کا کوئی اچھا معیار قائم نہیں کیا. کیونکہ اس تنقیح طلب مسئلہ کی نوعیت بنیادی طور پر بدل جائیگی اور یہ کتمان حق قارئین کی گمراہی کا باعث بن جائے گا.

۱۹—فخرالدولہ کا سال وفات:

فاضل معترض فرماتے ہیں: «اس کے بعد ہمارے فاضل نے تاریخی پس منظر پیش کیا ہے . . . اس بیان میں بہت سی خامیاں نظر آتی ہیں، اول تو یہ کہ فخرالدولہ کی وفات ۳۸۸ ھ میں ہوئی نہ کہ ۳۸۷ ھ میں اور اس کے فوراً بعد قابوس بن وشمگیر طبرستان پر قابض ہوگیا . . . دوسرے یہ کہ اگر ۳۸۷ ھ میں فخرالدولہ وفات پاچکا تھا تو ۳۸۸ میں اس کا رے میں موجود ہونا کیسے ثابت ہوا . . . تیسرے یہ کہ بیرونی ۳۸۴ ھ یا ۳۸۵ ھ کے ہنگامے کے بعد جرجانیہ سے رخصت ہوچکا تھا».

اس تنقید و تبصرے میں فاضل معترض کا اعتماد زخاؤ کے مقدمہ پر رہا ہے جو اس نے «الآثار الباقیہ» کے انگریزی ترجمہ پر لکھا ہے. زخاؤ کی شخصیت واجب الاحترام ہے اور اسلامیات کی تاریخ میں اس کا بڑا مقام، بالخصوص «البیرونیات» کا کوئی طالب علم اس کی تحقیقات سے بے نیاز نہیں ہوسکتا. مگر «الآثار الباقیہ» کا یہ ترجمہ ۱۸۷۹ء میں شائع ہوا تھا جسے چوراسی سال ہورہے ہیں اور اس عرصہ میں اسلامیات کے اہم مصادر جو اس زمانہ میں مخطوطات کی شکل میں بھی کمیاب تھے، اب طبع ہوکر عامۂ اہل علم کی دسترس تک آگئے ہیں. ان مآخذ و مصادر

کی فراوانی اور سہولت حصول کے پیش نظر پچھلی صدی کی تحقیقات میں معتدبہ اضافہ ہوا ہے اور ان اضافوں کی روشنی میں زخاؤ اور دیگر مستشرقین کی رایوں پر نظر ثانی ضروری ہوگئی ہے مثلاً ڈاکٹر زخاؤ نے «کتاب الهند» کے انگریزی ترجمہ کے آخر میں جو تعلیقات دی ہیں، اُن میں «زرقان» کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ یہ قطعی غیر معروف شخصیت ہے لیکن اب جب کہ امام عبدالقاہر بغدادی کی «الفرق بین الفرق» امام ابوالحسن الاشعری کی «مقالات الإسلامیین» مرتضی زیدی کا «طبقات المعتزلہ» کی «التنبیہ والاشراف» چھپ گئے ہیں، زرقان اور اُس کی «کتاب المقالات» کے متعلق مزید معلومات حاصل ہوگئی ہیں، جن کی روشنی میں اس کی رائے پر نظر ثانی کرنا ناگزیر ہوگیا ہے۔ زخاؤ کا خیال تھا کہ زرقان نے فرقہ سمنیہ (بدھ مذہب) پر کوئی کتاب لکھی تھی جسے ایرانشہری نے اپنی کتاب میں شامل کرلیا تھا۔ لیکن اب ثابت ہوگیا ہے کہ اس کی «کتاب المقالات» صرف بدھ مذہب ہی پر نہیں تھی، بلکہ مختلف اسلامی اور غیر اسلامی فرقوں کے معتقدات پر مشتمل تھی جس کے اُس حصہ کو جو فرقۂ سمینہ سے متعلق تھا، ایرانشہری نے اپنی کتاب میں نقل کرلیا تھا۔ خود ابوالعباس ایرانشہری کے متعلق زخاؤ نے «الآثار الباقیہ» اور «کتاب الهند» سے جو معلومات حاصل کی تھیں، البیرونی کی دوسری کتابوں مثلاً «قانون مسعودی، افراد المقال» وغیرہ، نیز ناصر خسرو کی «زادالمسافرین» کی اشاعت کے بعد ان پر بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے اور اب اس کی حیثیت محض ایک «مقالات نویس» کی نہیں رہی، بلکہ ایک حکیم بانی مذہب کی ہے۔

اسی طرح اس نے «فردوس الحکمة» کے مصنف کا نام «علی بن زین» بزائے ہوز و یائے حطی) پڑھا تھا[1]۔

میں نے فخر الدولہ کا سال وفات ۳۸۷ ھ لکھا تھا مگر قریشی صاحب مصر ہیں کہ نہیں اس کی وفات ۳۸۸ ھ میں ہوئی۔ فاضل نے اس اصرار کے جواز میں زخاؤ کی «تمہید آثار» ص۲۲ کے علاوہ عربی فارسی مأخذو

(۱) Ibid vol. II p. 253

مصادر کا کوئی حوالہ نہیں دیا ۔ اس کے برعکس میں نے فخر الدولہ کی تاریخ وفات مستند تواریخ کے مطالعہ کے بعد لکھی تھی ۔ دیکھیے « کامل » لابن الأثیر جس میں فخر الدولہ کا سال وفات ۳۸۷ھ درج ہے[1]. پھر وہ اس سال کے اہم واقعات میں « ذکر وفاۃ فخرالدولہ بن بویہ و ملک ابنہ مجدالدولہ » کے زیر عنوان لکھتا ہے : « فی ہذہ السنۃ توفی فخر الدولہ ابوالحسن علی بن رکن الدولہ ابی علی الحسن بن بویہ بقلعۃ طبرق فی شعبان ». اسی طرح ابو الفداء ۳۸۷ ھ کے واقعات میں « ذکر وفاۃ فخرالدولہ » کو تحریر کرتا ہے : « وفی ہذہ السنۃ توفی فخرالدولہ ابوالحسن علی بن رکن الدولہ ابی علی الحسن بن بویہ بقلعۃ طبرک فی شعبان و اقعدوا فی الملک بعدہ ولدہ مجدالدولہ ابا طالب رستم ». اسی طرح رشید الدین فضل اللہ « جامع التواریخ » میں لکھتا ہے : « و برعقب حادثۂ او ( سبکتگین ) خبر وفات فخر الدولہ علی بن بویہ برسید و ہر دو در شعبان سنۃ سبع و ثمانین و ثلثمائۃ سپری شدند »[2] . حمد اللہ مستوفی لکھتا ہے[3] : « فخرالدولہ در سنہ سبع و ثمانین و ثلثمائۃ در گزشت پسرش مجدالدولہ رستم یازدہ سالہ بود و منکوحہ اش سیدہ بر ملک مستولی شد » .

یہ بعد کے مؤرخین کی تصریحات تھیں ، عصری مؤرخین نے بھی اسی کی تصریح کی ہے کہ فخر الدولہ نے ۳۸۷ ھ میں وفات پائی ۔ چنانچہ گردیزی « زین الأخبار » میں جو فخرالدولہ کی وفات کے پچاس پچپن سال بعد ہی لکھی گئی تھی کہتا ہے[4] : « و امیر رضی ابوالقاسم نوح بیمار شد و درگذشت روز آدینہ سیزدہم رجب سنہ سبع و ثمانین و ثلثمائۃ و اندر شعبان این سال ابوالحسن علی بن حسن بویہ نیز بمرد و امیر سبکتگین ببلخ

---

(۱) ابن الأثیر : کامل ۹ : ٤٤ – ٤٥

(۲) جامع التواریخ ( تاریخ غزنویان و سامانیان و آل بویہ ) مرتبہ محمد دبیر سیاقی مطبوعہ چاپخانہ کیہان تہران ۱۹۵۹ء میلادی ص ٦٢

(۳) تاریخ گزیدہ : ٤٢٦

(٤) گردیزی : زین الأخبار : ٥٨

نالان شد ، قصد غزنین کرد ، اندر راه بمرد و این واقعه در شعبان سنه سبع و ثمانین و ثلثمائة بود » .

لیکن اس واقعہ کا ہم عصر مؤرخ عتبی ہے جس نے چشم دید شاہدوں کی روایت کی بنیاد پر « تاریخ یمینی » میں لکھا ہے[1] : « ردف الحادثة به ( السبکتگین ) لفخرالدوله علی بن بویه و کانت وفاتهما فی شعبان سنه سبع و ثمانین و ثلثمائة ».

مؤرخین سابقین کی ان تصریحات کے بعد ، جن کی تعداد میں بکرات و مرات اضافہ کیا جاسکتا ہے[2] فاضل معترض کی اس نکتہ چینی پر کہ « فخرالدولہ کی وفات ۳۸۸ ھ میں ہوئی نہ کہ ۳۸۷ ھ میں » کسی مزید تبصرے کی ضرورت نہیں رہتی .

فاضل معترض کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ فخر الدولہ کی وفات کے فوراً بعد قابوس بن وشمگیر طبرستان پر قابض ہوگیا . فخر الدولہ ضرور مرگیا تھا مگر « اس کا دربار » نہیں مرا تھا اور عہد فخری کی عظمت و شوکت باقی تھی . اس لیے قابوس اور اس کے ہوا خواہوں کی یورشوں کے سدباب کے لیے مدبرین دربار نے جرجان کی محافظت کے واسطے آزمودہ‌کار سپہ سالاروں کو بھیجا اور اس طرح فریقین میں معرکہ آرائی کا سلسلہ شروع ہوا جو عرصہ تک چلتا رہا . فخرالدولہ کی وفات ۳۸۷ ھ میں ہوئی اور قابوس پورے ایک سال کے بعد جرجان میں داخل ہوسکا . عتبی لکھتا ہے[3] : « فسار الی جرجان . . . و دخلها فی شعبان سنة ثمان و ثمانین و ثلثمائة » اسی طرح رشید الدین فضل اللہ رقم طراز ہے[4] « این بشارت بقابوس رسید . . . و روے بجرجان نهاد و در شعبان سنه ثمان و ثمانین و ثلثمائة در مسند ملک و مستقر عز متمکن نشست » .

---

(۱) عتبی : تاریخ یمینی : ۱۰۸ ، ۱۰۹

(۲) مزید شواہد کے لیے دیکھیے میرخوند : روضة‌الصفا ٤ : ٥٧ اور اسی مصنف کی حبیب السیر ٤ : ٥٢

(۳) تاریخ یمینی : ۱۷٤

(٤) رشید الدین فضل اللہ : جامع التواریخ ۱۰۱

عتبی[1] اور رشید الدین فضل اللہ[2] نے اس سال بھر کی معرکہ آرائیوں کی تفصیل دی ہے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ قابوس جرجان پر ۳۸۸ ھ میں قابض ضرور ہوگیا تھا، لیکن اُسے اطمینان و سکون نصیب نہیں تھا۔ ظاہر ہے اس اضطراب و بے اطمینانی کی حالت میں اسے علمی سرپرستی کا موقعہ کیا ملا ہوگا۔ اس لیے البیرونی اس کے دربار میں ۳۸۹ ھ سے قبل نہیں پہنچا ہوگا۔

البیرونی کا رے جانا مسلم ہے۔ وہ خود «الآثار الباقیة» نیز «مقالید علم الهیئة» میں اس سفر کا ذکر کرتا ہے مگر اس کی تاریخ کی تصریح نہیں کرتا۔ بروکلمان کا خیال ہے کہ وہ ۳۸۲ ھ میں رے گیا تھا۔ معلوم نہیں اس کا ماخذ کیا ہے، ممکن ہے یہ قیاس آرائی ہو کہ چونکہ البیرونی اور الخجندی کی ملاقات ایک مسلم الثبوت واقعہ ہے جس کا وہ «قانون مسعودی»[3] نیز «مقالید علم الهیئة» میں حوالہ دیتا ہے اور الخجندی کی وفات ۳۸۲ ھ میں ہوئی تھی۔ اس لیے البیرونی ۳۸۲ ھ سے قبل رے گیا ہوگا۔

اس لیے یہ بھی ممکن ہے کہ البیرونی نے رے کا دو مرتبہ سفر کیا ہو۔ پہلی مرتبہ نوجوانی میں ۳۸۰ ھ کے قریب اور دوسری مرتبہ پختہ عمری میں ۳۸۸ھ کے قریب۔ میں اس معروضہ پر زور تو نہیں دیتا، مگر اہل علم کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ اس سلسلے میں یہ بات خاص طور سے قابل غور ہے کہ «قانون» اور «مقالید» میں البیرونی نے جو لہجہ اس سلسلے میں اختیار کیا ہے۔ وہ اس لہجے سے قطعاً مختلف ہے جو اس نے «الآثار الباقیة» میں اختیار کیا ہے۔ البیرونی مستقلاً ۳۸٦ ھ تک خوارزم (کاث) میں آل عراق کی سرپرستی میں مقیم رہا، چنانچہ وہ اپنے محسنوں کی فہرست میں پہلے اسی خاندان بالخصوص ابو نصر منصور بن علی بن عراق کا ذکر کرتا ہے[4]:

---

(۱) تاریخ یمینی ۱۷۰ ـ ۱۸۸ (۲) جامع التواریخ : ۹۸ ـ ۱۰٦
(۳) قانون مسعودي ۱ : ۳٦٤ (٤) معجم الأدباء ٦ : ۳۱۲

مضی أکثر الأیام فی ظل نعمة   علی رتب فیها علوت کراسیا
فآل عراق قد غذونی بدرّهم   و منصور منهم قد تولّی غراسیا

۳۸۵ھ کے بعد خوارزم کے دونوں فرمانرواؤں (ابو عبداللہ خوارزم‌شاہ اور مأمون بن محمد والی جرجانیہ) میں چپقلش کا سلسلہ شروع ہوا جس کے نتیجے میں سنہ ۳۸۶ھ کے آخر میں کاث کے آخری بادشاہ ابوعبداللہ خوارزمشاہ کو تاج شاہی سے ہاتھ دھونا پڑا اور گرفتار ہوکر جرجانیہ لےجایا گیا۔ اسکے بعد شہر میں ہرج مرج شروع ہوا۔ غالباً ابونصر بن عراق بھی خاندان شاہی کے دیگر افراد کے ساتھ جرجانیہ لےجایا گیا، جہاں وہ بعد میں رہا ہوا اور دروازہ شہر کے قریب ایک بڑی جاگیر میں رہنے لگا۔ البیرونی کچھ دن کاث ہی میں خانہ نشین رہا (تحصن) پھر امان لیکر ترک وطن پر مجبور ہوا (ما أحوج إلی... التحصن ثم الاستیمان والاغتراب) تین سال اس کے بڑے اضطراب میں گزرے۔ پہلے وہ باوندی اسپہبد جیل جیلان مرزبان بن رستم کے کنف حمایت میں پہنچا اور اسکے یہاں «مقالید علم الهیئة» تصنیف کرکے اسکے نام پر معنون کی۔ لیکن اس کے مصائب کا زمانہ ابھی ختم نہیں ہوا کیونکہ سنہ ۳۸۷ھ کے آخر یا سنہ ۳۸۸ھ کے آغاز میں اس کے مربیوں کو اپنے حریف شہر یار بن شروین کے ہاتھوں جو قابوس بن وشمگیر کا طرفدار تھا ملک چھوڑنا پڑا۔ البیرونی بھی وہاں سے نکلا اور چونکہ اسکے مربی دربار رے کے باجگذار تھے، اس سے وہ فطرتاً رے ہی میں متوطن ہونے کے ارادے سے چلا۔ مگر وہاں اس کی وہ قدر نہ ہوئی جسکی اُسے توقع تھی «الآثار الباقیه» میں وہ اسی بیقدری کا شکوہ سنج ہے[1]۔

اس کے برخلاف «قانون» اور «مقالید» میں سفر رے کا جو تذکرہ کرتا ہے اس میں اس مایوسی کا شائبہ نہیں ہے جو کسی باکمال کو زمانہ کی قدر ناشناسی سے لاحق ہوتی ہے بلکہ ایک قسم کا احساس برتری پایا جاتا ہے جو خوردوں کو بزرگوں کی عزت افزائی سے حاصل ہوتی ہے۔ مثلاً «قانون»

(۱) البیرونی: الآثار الباقیه: ۳۳۸

میں وہ بڑے فخریہ انداز میں کہتا ہے کہ الخجندی نے اس سے اپنی غلطی کا اعتراف کیا[1]:

« کمعل ابی محمود الخجندی بالری فانه أوجبها دقیقتین و احدی و عشرین ثانیة وقد اعترف لی صاحبه شفاها بفساد الآلة فی احد المنقلبین .

اسی طرح «مقالید» میں اس کے لہجے کے اندر ایک خود اعتمادی ہے[2] : « ثم حالت بلد الری بعد ذالک ولقیت أبا محمود حامد بن خضر الخجندی و أخرج الیّ کتاباً عمله . . .» یہیں کوشیار بن لبان جیلی سے جو عمر میں البیرونی سے کہیں بڑا تھا ملاقات ہوئی اور باوجود اس تفاوت عمر کے اس نے اسکے سامنے بعض حقائق کا اعتراف کیا[3] : « فأما کوشیار فقد اعترف عند حضور ابی محمود لدیه ان لیس له منه الا التهذیب و الایجاز و التنقیح » .

یہ واقعات میرے پیش کردہ مفروضے کی تائید کرتے ہیں « الآثار الباقیه » میں مذکور سفر رے ان دونوں سفروں سے مختلف معلوم ہوتا ہے اور « فانی کنت فی ذالک الوقت ممتحناً من جمیع الجهات مختل الحال » سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک جانب اپنے وطن مالوف ( کاث ) سے بے گھر ہونے کا شکوہ سنج ہے اور دوسری جانب نئی پناہ گاہ ( فریم ) سے نکلنے کا شاکی ہے .

رے سے وہ جرجان چلا . راستے میں کسی رئیس کے نام پر « الإستیعاب لوجوه الممکنة لصنعة الاصطرلاب » تصنیف کی جس میں وہ بار بار اپنی بیسروسامانی کا شکوہ کرتا ہے[4] .

بہر حال فاضل معترض کا یہ کہنا کہ جرجان پہنچنے سے پہلے اور رے سے رخصت ہونے کے بعد وہ غالباً مازندگان کے اسپہبد مرزبان

(۱) قانون ا : ٢٦٤

(۲) «البیرونی اور اصفهبذ جلیجلان مرزبان بن رستم» از ابو محفوظ الکریم معصومی برهان (مئی ۱۹۵۵) . (۳) ایضاً : ۳۰٤ (٤) ایضاً : ۳۰٥

بن رستم بن شروین کے دربار میں گیا جہاں اس نے اپنی کتاب «مقالید علم الھیئة» اس کے نام پر معنون کی محل نظر ہے ۔ اگر یہ دعوی الخجندی سے البیروی کی ملاقات کی بنیاد پر کیا گیا ہے تو ناقابل تسلیم ہے ۔ الخجندی سنہ ۳۸۲ھ میں وفات پاچکا تھا اس لیے یہ ملاقات اس سے پہلے ہی ہوئی ہوگی حالانکہ حسب تصریح و استشهاد فاضل معترض سنہ ۳۸٤۔ ۳۸۵ھ میں البیرونی خوارزم میں موجود پایا جاتا ہے ۔

فاضل معترض لکھتے ہیں : «دوسرے یہ کہ اگر ۳۸۷ھ میں فخرالدولہ وفات پاچکا تھا تو ۳۸۸ھ میں اس کا رے میں موجود ہونا کیسے ثابت ہوا » میں نے اپنے مضمون میں کہیں یہ نہیں لکھا کہ فخرالدولہ ۳۸۸ھ میں رے میں موجود تھا ۔ لیکن اگر میرے اس فقرے سے کہ اس کا دربار بھی ریاضی و ہیئت اور نجوم کے افاضل کا مجموعہ تھا سنہ ۳۸۸ھ کے قریب البیرونی بھی وہاں گیا تھا » ۔ انہیں یہ شبہہ ہوا تو یہ بےبنیاد ہے اور عجلت فرمائی کا نتیجہ ہے «وہاں» کا مرجع رے ہے جہاں فخرالدولہ کا دربار تھا ۔ اور یہ اوپر واضح ہوچکا ہے کہ فخرالدولہ کی وفات کے بعد بھی اس کا دربار اپنی پوری عظمت و شوکت کے ساتھ باقی رہا ۔ البیروی اسی دربار میں پہنچا تھا ۔

فاضل معترض کا یہ فرمانا بھی محل نظر ہے کہ «البیرونی ۳۸۱ھ یا ۳۸۵ھ کے ہنگامے کے بعد جرجانیہ سے رخصت ہوچکا تھا» ۔

اولاً چونکہ ان کے ذہن میں خوارزم کی سیاسی صورت حال کا کوئی واضح نقشہ نہیں تھا، اس لیے انھوں نے البیرونی کا وطن جرجانیہ فرض کر لیا تھا حالانکہ وہ کاث کا باشندہ تھا ۔ اس لیے جرجانیہ سے رخصت ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ ہاں وہ سنہ ۳۶۳ھ کے شروع میں جرجانیہ پہنچا جو مامونی فرماں رواؤں کا پایۂ تخت تھا ۔

ثانیاً یہ ہنگامہ ۳۸٤ھ یا ۳۸۵ھ میں نہیں ہوا تھا ۔ اس کا آغاز غرۂ شہر رمضان سنة ست و ثمانين و ثلاثمائة (۳۸٦ھ)[1] سے ہوا جبکہ ابو عبداللہ

(۱) العبتی : تاریخ یمینی : ۹۳—۹۵

خوارزمشاہ نے بیخبری میں ابوعلی یمجور پر شبخون مارا اور اسے گرفتار کرکے کاث (مدینۂ خوارزم) لے‌گیا. جب مامون بن محمد والی جرجانیہ کو اس کا پتا چلا تو اس نے انتقام کی تیاری شروع کی (بات یرعی النجوم ارقالی ان اسبب له التدبیر علیه) ظاہر ہے اس تیاری میں وقت لگا ہوگا. اس لیے مامون بن محمد کا خوارزم (کاث) پر حملہ اور اسکے نتیجے میں ہرج مرج سنہ ۳۸۲ھ سے قبل نہیں ہوا ہوگا. اس ہرج مرج میں البیرونی خانہ نشیں ہوگیا. «تحدید» کی ایک روایت کے مطابق جسے فاضل معترض نے نقل کیا ہے البیرونی کی رضامندی کا منصوبہ معرض تعویق میں پڑ گیا (ما أحوج إلی تعطیل ذلک) مگر یہ تعویق عارضی تھی. کیوں‌کہ حسب روایت فاضل معترض ابو الوفاء اور البیرونی سے فلکیاتی مشاہدات کے سلسلے میں خط کتابت ہورہی تھی جس کے نتیجے میں اُس نے مدینۂ خوارزم (کاث) میں سنہ ۳۸۷ھ میں چاندگہن کا مشاہدہ کیا: (و أنا بمدینة خوارزم علی کسوف قمری، رصدناه معا فی سنة سبع و ثمانین و ثلاث‌مائة للهجرة).

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۳۸۷ھ میں اپنے وطن مالوف (کاث خوارزم) میں موجود تھا. اس‌کے بعد وہ مامونی نائب کاث سے امان طلب کرکے شہر خواردم سے نکل پڑا ارر فریم (پریم کوہ) پہنچا جہاں اس نے مرزبان بن رستم کے نام پر «مقالید علم‌الهیئة» لکھ‌کر معنون کی. لیکن سنہ ۳۸۸ھ میں قابوس کے طرفدار شہریار بن دارا نے اس شہرکو فتح کرلیا تو البیرونی یہاں سے بھی نکلنے پر مجبور ہوا اور رے پہنچا. مگر وہاں اس‌کی حسب دلخواہ قدردانی ہوئی. اس لیے بددل ہوکر جرجان قابوس بن و شمگیر کے دربار میں وارد ہوا جہاں توقع سے زیادہ اس کا احترام ہوا[1].

فاضل معترض فرماتے ہیں کہ «جرجان پہنچنے سے پہلے اور رے سے رخصت ہونے کے بعد وہ غالباً مازندران رستم بن شروین کے دربار

(۱) یاقوت‌الحموی: معجم‌الأدباء: ٦: ۳۰۹

میں گیا میرا خیال ہے کہ پہلے وہ مرزبان بن رستم کے یہاں گیا تھا وہاں سے رے آیا اور رے سے وہ جرجان گیا ۔

چہار مقالہ کی حکایت پنجم و مقالۂ چہارم کا تنقیدی مطالعہ :

« شیخ بوعلی سینا » اور « آل عراق » کے ذکر پر تبصرے کے ضمن میں پانچ تنقیح طلب نکات قائم کیے گیے ہیں ۔ مگر اس سلسلے میں بنیادی مسئلہ « چہار مقالہ » کی حکایت پنجم مقالۂ سوم کی تحقیق کا ہے ۔ فاضل معترض نے اس باب میں کوئی محقق بات نہیں کہی صرف زخاؤ کی رائے کو دہرا دیا ہے جو خود اس سلسلے میں کوئی واضح تنقید پیش نہیں کرتا ۔

قدیم مؤرخین نے اس روایت کو ( باندک تغیر ) اپنی تصانیف میں اس انداز سے نقل کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اس کی صحت میں کوئی شک نہیں تھا ۔ خواند میر نے اس حکایت کے صحیح ہونے کی غیر مبہم الفاظ میں صراحت کی ہے[1]:

« بصحت پیوستہ کہ دران آوان کہ کوکب دولت سلطان محمود غزنوی بدرجہ استقلال رسید بعضے از اہل شروفساد عرض رسانیدند کہ شیخ ابوعلی بد مذہب است ۔ سلطان محمود از غایت عصبیت قصد شیخ فرمودہ ابوالفضل حسن بن میکال را نزد خوارزمشاہ ارسال داشت و پیغام دادکہ چنان معلوم شد کہ دران دیار جمعی از افاضل عدیم المثل توطن دارند باید کہ ایشان را بپایہ سریر اعلیٰ فرستی . . . ابو ریحان و ابو الخیر ملازمت سلطان اختیار کردند و ابوعلی و ابو سہل بتعجیل از خوارزم بیرون آمدہ راہ فرار پیش گرفتند و دربیابانی کہ میان خوارزم و ابیورد است سرگردانی بسیار کشیدہ ابوسہل دران صحرا از وفور تشنگی و گرما فوت شد و ابوعلی بدحال و بیمار بابیورد رسید و از انجا باستو و از استو بجرجان رفت » .

(۱) خواندمیر : حبیب السیر جلد : ۲ جزء : ٤٤٤ (تہران : ۱۳۳۳ شمسی)

قاضی احمد غفاری نے بھی اس حکایت کو «تاریخ جہان آرا» میں نقل کیا ہے مگر بقول قزوینی اس سے اتنا سہو ہوا ہے کہ «مامونیان خوارزم» اور «فریغونیان جوزجان» کو ایک سمجھ لیا . قاضی نوراللہ شوستری نے «مجالس المؤمنین» میں پوری حکایت تو نقل نہیں کی صرف سلطان محمود غزنوی کے شیخ بوعلی سینا کو خوارزم سے طلب کرنے کے واقعے کو مسلم الثبوت مان کر اس کی توجیہ کی ہے کہ اس نے بربنائے تعصب شیخ کو بلاکر قید کرنا چاہا اور بھی مؤرخین نے اس واقعے کو کلاً یا جزءاً نقل کیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اس کی صحت کے باب میں متردد نہ تھے .

عہد حاضر میں Elliot کا رجحان بھی اس کی صحت کی جانب ہے مگر انھوں نے اسکی توجیہ اپنے طور پر کی ہے کہ شیخ نے حسد کی بنا پر البیرونی کے ساتھ جانے سے انکار کردیا[1] .

زخاؤ ، حسب نقل فاضل معترض ، اس قصے کی صحت کا منکر ہے . اس کے انکار کی وجہ انھوں نے حسب ذیل نقل کی ہے :

«کن حالات میں اس نے اپنے وطن کو خیرباد کہا ؟ یہ سوال اب تک ایسے قصہ کہانیوں میں الجھا ہوا ہے کہ مجھے خوف ہے کہ (الف) مشرق کے لیے ذیل کی سطور تاریخ کے ایک عمدہ اور باوقار چہرے پر ایک بدنما داغ ہے . . . . . . (ب) یہ بیان واقعات کی کسوٹی پر پورا نہیں اُترتا . (ج) یہ یقینی ہے کہ ابن سینا اور ابوسہل ۴۰۳ھ سے پہلے ہی خوارزم سے فرار ہوچکے تھے . . . اور شاید ۴۰۰ھ سے بھی پہلے جب کہ ان کا مربی شاہزادہ علی بن مامون انتقال کرچکا تھا ، اس لیے کہ ابن سینا جرجان پہنچنے کے فوراً بعد شمس المعالی (م ۴۰۳ھ) کے دربار سے وابستہ ہوگیا تھا اور البیرونی اور ابوالخیر نے پہلی مرتبہ ۴۰۷ھ کے بعد غزنہ جانے سے پہلے

(۱) Elliot and Dawson , *History of India* (1869) ii. 3

خوارزم کو خیرباد کہا جیسا کہ سطور ذیل سے مترشح ہوتا ہے
حالانکہ (د) مذکورہ بالا بیان میں ان کے زمانۂ روانگی اور
وجوہات جلاوطنی کے متعلق بالکل مختلف واقعات بلا سوچے
سمجھے الجھا دیے گئے ہیں »۔

مگر زخاؤ کو یہ قصہ صرف « حبیب‌السیر » اور « نگارستان » میں ملا تھا ۔ « چہار مقالہ » اُس وقت تک منظر عام پر نہیں آیا تھا اسی لیے اُس نے لکھا تھا « میں ابھی تک اس بیان کے ماخذ کی تلاش میں کامیاب نہیں ہوا » ۔

غالباً سنہ ۱۸۹۶ء میں علمی دنیا فارسی ادب کے اس اہم شاہکار « چہار مقالہ » سے پہلی مرتبہ واقف ہوئی ۔ اس سال ایتھے اور نولدکے نے اس پر تعارفی نوٹ لکھے ۔ اگلے سال (۱۸۹۷ء) میں براؤن نے اسے متعارف کرایا اور سنہ ۱۹۱۰ء میں قزوینی نے اسے شائع کیا ۔ چونکہ قزوینی، زخاؤ کی رائے سے متأثر ہوچکے تھے اس لیے انہوں نے اس حکایت کی صحت میں شک و تردد کا اظہار کیا : « و کیفیت رفتن ابو ریحان از خوارزم بخدمت سلطان محمود چنانکه درین حکایت چهار مقاله مسطور است گویا بی اصل باشد »[1] اُنھوں نے اس « بے اصل باشد » کے سلسلے میں تین دلیلیں دی ہیں :

(و) « اما انیکه نظامی عروضی ابو نصر بن عراق را برادر زادهٔ خوارزمشاه دانسته است از ملاحظهٔ نسب هردو معلوم می‌شود که باطل است . چه خوارزمشاه ابوالعباس مامون بن مامون بن محمد است و صاحبِ ترجمه منصور بن علی بن عراق و شاید نسبتی دیگر بین ایشان بوده است »[2] ۔

(ز) « آنچه درین حکایت متعلق بملاقات ابوعلی با امیر قابوس است باید مجعول و بے اصل باشد »[3] ۔

---

(۱) قزوینی : تعلیقات چهار مقاله : ۲۴۳

(۲) ایضاً : ۲۴۹ (۳) ایضاً : ۲۵۱

(ح)' « مصنف را درین فقره دو سهو واضح است یکی آنکه
وزارت ابوعلی در رے فرض کرده و حالانکه در همدان
بوده است دیگر آنکه ابوعلی را وزیر علاءالدوله دانسته و
و حالانکه او هیچ وقت وزارت علاءالدوله را ننمود »[1] .

قزوینی نے اس حکایت کے اس جزو کو « بے اصل » بتایا ہے جو البیرونی کے غزنی جانے سے متعلق ہے . لیکن حال ہی میں ( سنہ ۱۳۲۳ خورشیدی) آقائے سعید نفیسی نے شیخ کی ایک مبسوط سوانح عمری « پور سینا » کے نام سے شائع کی ہے اس میں باقی حکایت کی صحت سے بھی انکار کیا ہے[2] :

« داستانی که دربارهٔ ابن سینا و محمود غزنوی رواج بسیار دارد بکلی ساختگی و نا درست است . چنان می نماید که این داستان را نخست نظامی عروضی سمرقندی در چهار مقاله جعل یا از مأخذ نا معتبری نقل کرده باشد » .

اس کے بعد اُنھوں نے اپنے تبصرے کی تائید میں تین دلیلیں دی ہیں[3]

(ط) نخست آنکه ابونصر عراق و ابوالریحان بیرونی و ابوالخیر
خمار تا پایان پادشاهی خوارزم شاهیان در خوارزم
مانده اند .

(ی)' « دلیل دیگر این است که ابن سینا خود صریحاً در سرگذشت
خویش می گوید . . . . . . . . بیرون رفتن وے از
خوارزم درهمان زمانی رخ داده است که قابوس در
گذشته . . . دلیل دیگر این ست که قطعاً ابن سینا در
سراسر زندگی خود قابوس را ندیده و با او روبرو
نشده است .

---

(۱) قزوینی : تعلیقات : چهار مقاله : ۲۵۱
(۲) سعید نفیسی : پورسینا : ۱۵۲
(۳) ایضاً : ۱۵۷

(یا) «خواجه حسین بن علی میکال که نظامی می نویسد درین واقعه رسول محمود در دربار خوارزم بوده است درست معلوم نیست کیست . . . درین خاندان ابو عبدالله حسین بن ابوالقاسم علی مطوعی یگانه کسی است که حسین بن علی بوده است . . . و تا حوالی ۴۵۰ زنده بوده است . . . گمان نمیرود این حسین بن علی که تا حدود ۴۵۰ زنده بود ۴۲ سال پیش ازان بدان درجه از احترام و اهمیت رسیده بوده باشد که محمود او را بدربار خوارزمشاه برسالت فرستاده باشد» .

لیکن یورپی فضلاء هوں یا ایرانی ادباء دونوں کے دلائل ضعیف هیں اور ایسا اندیشه هوتا هے که اس عهد کی تاریخ ایران سے سطحی واقفیت کا نتیجه هیں :

(الف) مشرق هو یا مغرب دونوں هی کے چهرے اس قسم کے بدنما داغوں سے داغدار هیں . نه محکمهٔ «احتساب مذهبی» کی کارگزاریاں مغرب کے لیے وجه افتخار هیں نه ملاحدۂ باطنیه کی سرگرمیاں جس کے نتیجه میں هزاروں امراء اور علماء فدائیوں کے هاتهوں قتل هوئے مشرق کے لیے سرمایهٔ فخر و مباهات کہے جاسکتے هیں، با این همه یه تاریخ کے سنگین واقعات هیں جن سے انکار نهیں کیا جاسکتا . محمود کا یه پیغام طلب اور ابن سینا کا «فرار» بهی کچهه اس قسم کا بدنما داغ تها .

(ب) زخاؤ نے ان واقعات کی تفصیل نهیں دی جن کی کسوٹی پر بقول اس کے یه بیان پورا نهیں اُترتا اور نه فاضل معترض نے ان کی وضاحت فرمائی ورنه اس عهد کی سطحی و زیر سطحی تحریکوں کے مطالعه سے معلوم هوتا هے که یه بیان ان کے ساتهه بالکل هم آهنگ هے .

(ج) ایسا اندیشه هوتا هے که خود زخاؤ کے ذهن میں ابن سینا کے فرار کا کوئی واضح نقشه نه تها اس کے پیش نظر وه مصادر نه تهے جو اب عام دسترس میں آگئے هیں بالخصوص شیخ کی خود نوشت سوانح عمری یا

ابن القفطی کی « تاریخ الحکماء » یا ابن ابی اصیبعه کی « طبقات الأطباء » وغیرہ جس میں انھوں نے اس خودنوشت سوانح عمری کو باندک تغیر نقل کیا ہے۔ اس قلت مصادر کی بنا پر بقول فاضل معترض وہ کہتا ہے کہ « ابن سینا جرجان پہنچنے کے فوراً بعد شمس المعالی کے دربار سے وابستہ ہوگیا تھا (الایہ که « شمس المعالی کے دربار » سے مراد وہ دربار ہو جو اس نے جانشین کے لیے ورثے میں چھوڑا تھا) کیونکہ ابن سینا خود کہتا ہے کہ میرے جرجان پہنچنے سے پہلے قابوس مرچکا تھا۔

(د) روانگی اور وجوہ جلاوطنی کے متعلق تاریخی وضاحت آگے آرہی ہے۔

(ہ) زخاؤ نے اس بیان کے مأخذ کی عدم یافت کا شکوہ سنہ ۱۸۷۹ء میں کیا تھا۔ لیکن اب اس قصے کا اصل مأخذ « چہار مقالہ » منظر عام پر آگیا ہے۔

(و) قزوینی کی پہلی دلیل پر تبصرے سے پیشتر اس تلخ حقیقت کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے کہ ان کی سنجیدگی و متانت کے باوجود اس حکایت پر تعلیقات لکھتے وقت وطنی عصبیت نے ان کے ذہن کو صاف نہیں رہنے دیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ آل عراق کے استیصال کو جسے وہ خود مامونیوں کی حملہ آوری کا نتیجہ بتاتے ہیں « مامون بن محمود... در سنہ ۳۸۵ھ ابو عبداللہ خوارزمشاہ را گرفته بکشت و ممالک در تصرف وی در آمد » دوسری جگہ اسی استیصال کو انھوں نے محمود غزنوی کی طرف بلا تامل منسوب کردیا[1]:

«و آخرین ایشان ابو عبداللہ محمد بن احمد بن محمود بن عراق بوده است که ابو ریحان ازو بشهید تعبیر می نماید و گویا ایشان نیز مانند بسیاری از ملوک و بیوتات قدیمۀ دیگر از سطوت شمشیر سلطان قہار محمود غزنوی منقرض و متلاشی گردیدند »:

یہی عصبیت حکایت کی کما حقہ قراءت میں ان کے لیے حجاب اکبر

(۱) تعلیقات چہار مقالہ : ۲۴۸

بن گئی . نظامی عروضی نے صرف اتنا لکھا تھا : « اما ابو نصر برادر زادۂ خوارزمشاه بود » مگر قزوینی نے تعلیقات لکھتے وقت اُسے « برادر زادۂ خوارزمشاه مامون (باضافه مامون) پڑھ لیا اور پھر اس پر استبعاد کو اعتراض کی شکل دیدی .

لیکن ابو نصر بن عراق (یا ابو نصر منصور بن علی بن عراق) واقعتاً آخری خوارزم شاہی فرمان روا ابو عبداللہ خوارزمشاه کا بھتیجا تھا .

ممکن ہے قزوینی کو « خوارزمشاه » کے لقب سے التباس ہوا ہو جیسا کہ آگے تفصیل آئے گی. مامونی خاندان خوارزم کے مغربی حصے میں حکومت کرتا تھا مگر مشرقی حصہ (کاث) میں خوارزم کے قدیم شاہی خاندان « خوارزمشاه » کے لقب سے حکمراں تھا . حکومت تو عربوں کی فتح کے بعد ہی اس خاندان سے نکل گئی تھی صرف خاندانی لقب رہ گیا تھا ، سو وہ بھی سنہ ٣٨٦ھ میں مامون بن محمد نے چھین کر خود اختیار کر لیا (مزید تفصیل آگے آرہی ہے) اسی بنا پر نظامی عروضی سمرقندی نے ابو نصر بن عراق کو « برادر زادۂ خوارزمشاه » کہا تھا . مگر قزوینی نے اس تفصیل کو اس تعلیقات کے لکھتے وقت ملحوظ نہ رکھا اور اسی لیے اُسے یہ استبعاد ہوا .

(ز) شیخ بوعلی سینا اور قابوس کی ملاقات بیشک غلط ہے مگر شیخ کا جرجانی پہنچنا مسلم ہے[1] چنانچہ وہ خود اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھتا ہے :

« ثم دعت الضرورة إلى الانتقال إلى . . و منها إلى جرجان و كان قصدي الأمير قابوس فاتفق . . . . . موته . . . ثم مضيت إلى دهستان و مرضت بها مرضاً صعباً و عدت إلى جرجان » .

---

(١) چنانچه سعید نفیسی نے لکھا ہے : « در گرگان ابن سینا حتماً با خاندان قابوس روابطی بهم زده است چنانکه رسالتی در عرض گرگان برای زرین گیس دختر قابوس نوشته است که ابوالریحان البیرونی از آن یادکرده است » (پورسینا : ٧٦)

اسی طرح اُس کا مریض عشق کے مرض کی تشخیص کرنا بھی مسلمہ واقعہ ہے اور اس باب میں بھی کوئی استحالہ یا استبعاد نہیں ہے کہ اس نے یہ علاج جرجان میں کیا تھا اور قابوس کے عزیزوں میں سے کسی نوجوان کا معالجہ کیا تھا ۔ اس لیے قزوینی نے نظامی عروضی کے اس تسامح کے باوجود لکھا ہے: « هرچند صدق و صحت این حکایت به تحقیق نه پیوسته ولی شیخ ابوعلی سینا در کتاب قانون درفصل عشق اشارتی بدین نوع علاج فرموده گوید » . قانون کے اس طریق علاج کو ذکر کرنے کے بعد شیخ کے بعد وہ خود اس تجربے کو قانون میں نقل کرنے کا ذکر کرتے ہیں . شیخ نے قانون میں لکھا ہے : « فانا قد جرّبنا هذا . . . و قد رأينا من عاودته السلامة والقوة وعاد إلى طمه و كان قد بلغ الذبول و جاوزه وقاسى الأمراض الصعبة . . . لما أحسّ بوصله من معشوقه بعد معاودة فى فى أقصرمدة » .

شیخ عموماً ان طبی تجربات کا وقت اور مقام تحریر نہیں کیا کرتا جس طرح وہ اپنے ایک جگہ سے دوسری جگہ بھاگنے کی وجہ نہیں بتایا کرتا اور صرف اتنے ہی پر اکتفا کرتا ہے کہ « ثم دعت الضرورة الى الانتقال الى » اس نے رے میں مجدالدولہ دیلمی کے مالیخولیا کا علاج کیا تھا اور اس کے لیے تقویب قلب کا ایک نسخہ تجویز کیا تھا جسے وہ « الأدوية القلبية » میں بیان کرتا ہے . مگر وہ مجدالدولہ کا نام بالتصریح نہیں لیتا ، صرف اتنا ہی کہتا ہے[1] : « میں نے بعض اُمراء کا ( جو بادشاہوں کے قائم مقام تھے ) سخت قسم کے مالیخولیا کا جو مانیا ( جنون ) کی طرف مائل تھا علاج کیا » اسی طرح وہ (جس مصلحت سے بھی ہو) « قانون » میں وہ یہ نہیں بتاتا کہ جس شخص پر اس نے یہ نفسیاتی عمل اور تجربہ کیا تھا اور جسے اُس نے دیکھا کہ « عاودته السلامة » وہ کون تھا اور کہاں رہتا تھا . لیکن قراین اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ وہ قابوس بن وشمگیر کے خاندان کا کوئی فرد تھا. رهی خود قابوس سے شیخ کی ملاقات

(۱) ابن سینا : الأدوية القلبية : ۱۱٦ مترجمہ حکیم عبد اللطیف (کلکتہ ، ۱۹۵٦)

و اس قسم کے تسامحات بڑے بڑے مستند مؤرخین سے ہوئے ہیں مگر ان کی
بنا پر ان کی مؤرخانہ عظمت پر حرف نہیں آیا . لھذا اس تسامح کی وجہ
سے پورے واقعہ ہی کو مسترد کردینا غیر مستحسن ہے بالخصوص جبکہ
ان دو تین مسامحات کو چھوڑکر «چہار مقالہ» کی حکایت کی تفصیلات خود
شیخ کی سوانح عمری کے حرف بحرف مطابق ہیں .

(ح) شیخ کا وہاں جانا بھی امر مسلم ہے اور علاءالدولہ کے یہاں
اس کا پایۂ عالی بھی جو وزارت کے مماثل تھا) طےشدہ امر ہے ہرچند کہ وہ
اس کا باضابطہ وزیر نہیں تھا (جس طرح محقق طوسی ہلاکو کا وزیر نہیں تھا
بایں ہمہ خصوصی تقرب کی بنا پر وزیر ہی سمجھا جاتا تھا) . ان مختلف
واقعات میں جن میں سے ہر ایک طے شدہ حقیقت ہے، خلط مبحث کی بنا
پر نظامی عروضی سے یہ تسامحات ہوئے ہیں . با ایں ہمہ یہ اتنے شدید
نہیں ہیں کہ نفس واقعہ ہی کو جعلی اور بے اصل قراردے دیاجائے .

(ط) البیرونی وغیرہ سنہ ٤٠٨ھ تک خوارزم میں مقیم رہے تھے مگر
اس طویل قیام کے عملاً یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ درمیان میں عارضی طور
پر جرجانیہ سے اور کہیں نہ گئے ہوں .

(ی) آقاے سعید نفیسی کا دوسرا اعتراض وہی ہے جس کی توضیح
اوپر (ز) میں آچکی ہے . البتہ جس امیر سے جرجان میں شیخ کی ملاقات
ہوئی وہ قابوس نہیں تھا بلکہ اس کا بیٹا فلک‌المعالی منوچہر تھا . اس لیے
«سرگزشت ابن سینا» اور «چہار مقالہ» کی زیر بحث حکایت میں کوئی
منافاۃ نہیں ہے .

(یا) یہ پیغام (افاضل خوارزم کی غزنی میں طلبی) اتنا اہم نہیں تھا،
جس کے لیے ایک نئے امیر کو مامور کرنا مستبعد ہو . خواجہ حسین بن
علی میکال آداب سفارت کے باب میں نوآموز ہی کیوں نہ ہو مگر تھا تو
اس خاندان کا فرد جس کے ارکان اس قسم کے سفارتی معاملات کو طے
کیا کرتے تھے . اس لیے ایک کام جو بظاہر ثقافتی روابط پر مشتمل ہو
اگر ایک نوآموز ہی کو سونپ دیا گیا تو اس میں کیا استبعاد ہے . اہم

معامله وه تها که سلطان محمود نے اسی ابوالعباس مامون کے پاس اس غرض سے سفیر بھیجا که وه اس کی بالا دستی کو تسلیم کرلے اور اُس کے نام کا خطبه پڑھا جائے، جس کے اوپر اُمرائے دربار اتنے مشتعل ہوئے که کچھ دن بعد ابوالعباس مامون ہی کو قتل کرڈالا. بہرحال ایک نوآموز سفیر کا محض ایک ثقافتی معاملے کے لیے بھیجا جانا کسی طرح مستبعد نہیں ہے. یه اس صورت میں که «چہار مقاله» کا «خواجه حسین بن علی میکال» «ابو عبدالله حسین بن ابوالقاسم علی مطوعی» ہی ہو لیکن ایسا ہونا ضروری نہیں ہے. آقائے نفیسی نے اپنے مقدور بھر استقصاء کی کوشش کی ہے. لیکن تاریخ نے اس خاندان (خاندان میکالی) کے افراد کا تذکره بالا ستقصاء رکھنے کی پروا ہی کہاں کی ہے.

غرض اس حکایت کے سلسلے میں مستشرقین ہوں یا فضلائے ایران، دونوں نے جو کچھ کہا ہے، اُس کی حیثیت «تشکیک» سے زیاده نہیں ہے. چند جزوی تسامحات سے پورے واقعه کی صحت مقدوح نہیں ہوتی، بالخصوص جب که خود شیخ کے خود نوشته سوانح حیات اس کے مؤید ہیں، نیز اس عہد کی سطحی و زیر سطحی تحریکات اس کے ساتھ ہم آہنگ ہیں.

اس بات کی وضاحت کے لیے ہمیں چوتھی صدی ہجری کے ثلث آخر میں اس انقلابی تحریک کا مطالعه کرنا ہوگا جو خراسان میں پھیلی ہوئی تھی. عضدالدوله کی وفات کے بعد اسماعیلی خلیفۂ مصر العزیز باالله (۳۶۵ـ۳۸۶ ھ) کے حوصلے بہت زیاده بڑھ گئے اور اس کے دعاۃ جو پہلے ہی مشرقی ممالک کے عوام میں اس تحریک کا پروپگنڈا کررہے تھے، اب باضابطه مختلف صوبون کے ولاۃ امراء کو اپنی تحریک میں شرکت کی دعوت دینے لگے. مگر سوائے والی جرجانیه (مامونی خاندان) کے سب نے اس دعوت کو ٹھکرا دیا.

جرجانیه، خوارزم کے مغربی حصه کا نام تھا. مشرقی حصے میں جس کا صدر مقام شہرکاث تھا خوارزم کا قدیم شاہی خاندان رہتا تھا جسے

البیرونی «آل عراق» سے تعبیر کرتا ہے اور جس کے زیر سایۂ عاطفت اس نے اپنی زندگی کا ابتدائی حصہ گزارا۔ مغربی حصہ، جرجانیہ (کرکانج) کے والی نے حسب تصریح عبدالقادر البغدادی، اسمعیلی دعوت کو قبول کرلیا تھا۔ ماوراء النہر کے سامانی امراء میں سے بھی بعض با اثر امیر اس تحریک میں شریک ہوگئے تھے، جن میں ابوعلی بن سیمجور خاص طور سے مشہور ہے اسی لیے مامون بن محمد اور ابوعلی سیمجور میں بڑی دوستی تھی۔ اس کے برعکس ابوعلی سیمجور اور ابو عبداللہ خوارزمشاہ والی کاث میں دشمنی تھی، چنانچہ جب امیر خراسان نوح ابن منصور (۳۶۵ـ۳۸۷ھ) نے مامون بن محمد کو «نسا» اور ابو عبداللہ خوارزمشاہ کو «ابیورد» کا علاقہ انعام میں دیا تو ابوعلی نے «نسا» تو مامون بن محمد کو دے دیا مگر ابو عبداللہ خوارزمشاہ کو «ابیورد» سے بے نیل و مرام لوٹا دیا۔ اسی اندرونی منافرت کا نتیجہ تھا کہ جب ابو علی سامانی لشکر سے شکست کھا کر اپنے دوست مامون بن محمد کے پاس پناہ لینے پہنچا تو ابو عبداللہ خوارزم شاہ نے ہزار اسپ کے مقام پر شبخون مار کر اسے قید کرلیا۔ جب مامون بن محمد والی جرجانیہ کو اس کی خبر ملی تو اس نے خوارزمشاہ پر حملہ کرکے ابوعلی کو آزاد کرالیا اور خوارزمشاہ کو قید کرکے جرجانیہ لے گیا، جہاں اسے ایک دن محفل شراب میں قتل کر ڈالا۔

اب پورے خوارزم پر مامونی خاندان کا قبضہ ہوگیا اور چونکہ سامانی اقتدار ختم ہو رہا تھا، اس لیے جرجانیہ (خوارزم) کے حکمرانوں نے آزادی کے ساتھ اس تحریک کو فروغ دیا اور جرجانیۂ مشرق میں اسماعیلیوں کی انقلابی سازشوں کا گہوارہ بن گیا۔ لہٰذا ہر اسماعیلی داعی کرکانج (جرجانیہ) ہی کا رخ کرتا تھا چنانچہ ابو عبداللہ الناتلی جو ایک اسماعیلی داعی تھا اور جسے ابن سینا کے باپ نے اس کی تعلیم کے واسطے اپنے یہاں مہمان رکھا تھا، ابھی یہ تعلیم مکمل نہ ہونے پائی تھی کہ یکایک بخارا سے کرکانج (جرجانیہ) روانہ ہو گیا، شیخ نے الناتلی کے کرکانج جانے کے وقت کی تصریح نہیں کی۔ لیکن

اس کے بعد جو اپنی عمر بتاتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ الناتلی ۳۸۶ھ سے کچھ پہلے کرکانج روانہ ہوا تھا اور یہی وہ سال ہے جب کہ مامون بن محمد نے ابو عبداللہ خوارزمشاہ کو قتل کرکے پورے خوارزم پر قبضہ کرلیا اس لیے ابو عبداللہ الناتلی کا بخارا سے جرجانیہ جانا اس وقت کے ساتھ منطبق ہوتا ہے جب کہ ابو علی ابن سیمجور سامانی دربار سے بغاوت میں ناکام ہوکر اپنے قدیم دوست (اور ہم مسلک) مامون بن محمد سے خط کتابت کررہا تھا۔ اس لیے یہ باور کرنے کے کافی وجوہ ہیں کہ یہ خط کتابت سیاسی کے ساتھ مذہبی اور انقلابی بھی تھی اور غالباً اسی وجہ سے ابو عبداللہ الناتلی یکایک بخارا سے جرجانیہ روانہ ہوا تھا کہ اس انقلابی سازش کے بروے کار لانے میں حصہ لے سکے۔

۳۸۹ھ میں ایلک خاں والی کاشغر نے آخری سامانی فرمانروا عبدالملک بن نوح کو شکست دے کر اسے اور سامانی خاندان کے دوسرے افراد کو مختلف مقامات میں قید کردیا اور سلطان محمود غزنوی کے ساتھ صلح کرلی کہ «ماوراء النہر خان را باشد و ما دون النہر امیر محمود را» مگر ایک سامانی امیرزادہ ابو ابراہیم قید سے نکل بھاگا۔ کچھ دن بخارا میں چھپا رہا۔ اُس کے بعد وہاں سے نکل کر روانہ ہوا۔ اسماعیلی ہر چند کہ انقلاب کے خواہاں تھے مگر ایلک خاں کے قبضے سے، جسے ان کے جانی دشمن محمود کی تقویت حاصل تھی، ان کا مقصد حل نہ ہوا۔ اس لیے اُنھوں نے شورش جاری رکھنے کے لیے ابو ابراہیم منتصر کو موروثی ملک کی باز یابی کے نام سے پھر اُبھارا اور اسے جرجانیۂ خوارزم لے گیے وہاں سے اس نے اپنے نائب ارسلان بالو کو بخارا کی فتح کےلیے بھیجا۔ ارسلان بالو نے آکر ایلک خاں کے نائب جعفر تگین کو دیگر سرداران لشکر کے ساتھ گرفتار کرکے ابو ابراہیم منتصر کے پاس جرجانیہ بھیجا[1]۔

اس سے اسمعیلیوں کی انقلابی تحریک میں جرجانیہ کی مرکزیت اور اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

---

(۱) تاریخ یمینی : ۱۳۶

ارسلان بالو نے سمرقند کو بھی فتح کرلیا اور ابو ابراهیم منتصر دوباره بخارا پہنچ کر آبائی تحت پر متمکن هوا ۔ مگر جب ایلک‌خاں کو خبر ملی تو وہ اس کے تدارک کے لیے دوباره بخارا پر حمله آور هوا ۔ اس لیے ابو ابراهیم کو بخارا سے بھاگنا پڑا اور وہ آمل اور ابیورد هوتا هوا نیساپور پہنچا ۔ اسکے مفرور هونے کے بعد اس کے متوسلین اور دیگر اهل‌سازش کی تلاش کی گئی ۔ ان هی میں بخارا کے اسمعیلی بھی تھے ۔ اس لیے شیخ ابوعلی سینا کے لیے بخارا میں رهنا ناممکن هوگیا اور اب اس کے لیے اسکے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ جرجانیه (کرکانج) جاکر پناہ لے جو اسماعیلیوں کی انقلابی کارروائیوں کا مرکز تھا چنانچه وہ خود لکھتا هے کہ سنه ۳۹۲ھ میں حالات نے مجبور کردیا کہ وہ بخارا چھوڑکر جرجانیه (کرکانج) چلا جائے[1] مگر وہ دیگر مواقع کی طرح اس موقع پر بھی اس مجبوری کی کھل کر تصریح نہیں کرتا ۔

دوسری بات جو اس سلسلے میں قابل غور هے وہ سلطان محمود غزنوی کی «قرامطه بیزاری» هے ۔ اسی یقیں دهانی کی بدولت خلیفه القادر بالله عباسی نے اسے اس کے بھائی کے مقابلے میں تحت غزنی کا وارث تسلیم کیا تھا اور محمود نے آخر تک اس وعدہ کو نبھایا ۔ اسی باطنیت کے استیصال کے لیے اس نے ملتان پر حمله کیا جس کے نتیجے میں آنند پال سے جھگڑا هوا جو هندوستان پر اس کے بعد کے حملوں کا مفتتح بنا ۔ اسی باطنیت کے استیصال کے لیے اُس نے ٤٠٧ ھ میں خوارزم پر حمله کرکے اسے اپنی حکومت میں شامل کیا ۔ اسی باطنیت کے استیصال کے لیے اس نے ٤١٧ ھ میں حفیف والی سندھ پر حمله کرکے سندھ کو فتح کیا ۔ چنانچه شعرائے دربار میں سے فرخی نے اس موقعه پر جو قصیده کہا تھا اس میں فتح سندھ کی مبارکباد کے علاوہ مصر پر حمله کی بھی تحریض کی تھی جو اسماعیلیت کا مستقر تھا :

ژنده پیلان کز در دریای سند آورده ای    سال دیگر بگذرانی از لب دریای نیل

(۱) طبقات الاطباء : ۲ : ٤

قرمطی چندان کشی کز خون شان تاچند سال
چشمه های خون شود در بادیه ریگ مسیل
تا ز جامهٔ سوگواران بر زنان مصریان
همچو زر بخشش تو مست گرداند کفیل
وان سگ ملعون که خوانند اهل مصر اورا عزیز
سته و خسته بغزنین اندر آورده ذلیل

ایک اور قصیدے میں رے پر حملہ کے لیے برانگیختہ کرتا ہے :

رے را بهانه نیست، ببایدگرفت پس
وقت است اگر بجنگ سوی رے کشد عنان
اینجا همی یگان و دوگان قرمطی کشد
زینان به رے هزار بیابد یک زمان

اور اسی «قرامطہ کشی» اور استیصال باطنیت کے لیے اس نے رے پر حملہ کرکے اُسے اپنی قلمرو میں داخل کرلیا، چنانچہ فرخی نے اس موقعہ پر کہا تھا :

اے ملک گیتی، گیتی تراست حکم تو بر هرچه تو خواهی رواست
از پی کم کردن بد مذهبان در دل تو روز و شب اندیشهاست
تا سر آنان چو گیا بدروی کایشان گویند جهان چون گیاست
ملک رے از قرمطیان بستدی میل تو اکنون به منا و صفاست

یہ محض شاعرانہ حسن تعلیل ہی نہیں تھی بلکہ رے کی فتح کے بعد محمود نے خلیفہ القادر باللہ کو جو فتحنامہ بھیجا تھا، اس سے بھی اس کی وضاحت ہوتی ہے[1].

لیکن مجدالدولہ والی رے سے زیادہ سخت جان علاء الدولہ ابن کاکویہ ثابت ہوا اور اس کے فتنے کو مزید شہ شیخ بوعلی سینا سے ملی۔ بہرحال تیسری قابل غور بات شیخ بوعلی کی اسماعیلیت ہے۔ ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ شیخ کا خاندان اسماعیلی المذهب اور مصری خلیفہ کا تابع تھا[2].

---

(۱) ابن الجوزی : المنتظم ۲ : ۳۸ (۲) ابن تیمیہ : الرد علی المنطقیین : ۱۴۱ .

خود شیخ بوعلی سینا اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھتا ہے[1] :

« و كان أبي ممن أجاب داعي المصريين ويعدّ من الاسماعيلية و قد سمع منهم ذكرالنفس والعقل . . و كذلك أخي وكانوا ربما تذاكروا بينهم و انا اسمعهم وادرك مايقولونه و لا تقبله نفسي و ابتدا و يدعونني اليه » .

بیہقی « تتمۂ صوان الحکمۃ » میں لکھتا ہے کہ اس کا باپ رسائل «اخوان الصفا» کا ( جو باطنیہ فرقے کی مستند کتاب ہے ) مطالعہ کیا کرتا تھا اور شیخ بھی اکثر اس پر غور و خوض کیا کرتا تھا[2]. اور انہیں اسماعیلی تعلیمات اور یونانی فلسفہ کے امتزاج سے اس نے اپنا مخصوص فلسفیانہ نظام مرتب کیا جو ارسطاطالیسی فلسفہ و ما بعد الطبیعات سے قطعاً مختلف ہے[3] .

لیکن ابن سینا کی اسماعیلیت محض فلسفیانہ عبقریت تک محدود نہ تھی . اس نے اس تحریک میں عملی حصہ بھی لیا اور اس کی زندگی کا بیشتر حصہ اسی انقلابی تحریک کی تنظیم میں صرف ہوا .

چوتھی قابل غور بات محمود غزنوی اور بوعلی سینا کے تعلقات ہیں . اوپر ذکر آچکا ہے کہ مشرق میں اسماعیلیت کا گہوارہ خوارزم (جرجانیہ) تھا جب اسماعیلی دعاۃ بخارا میں سامانی حکومت کے خاتمے پر اپنا اثر و رسوخ قائم کرنے میں ناکام ہوگئے تو وہاں سے بھاگنے پر مجبور ہوئے . انہیں میں شیخ بوعلی سینا بھی تھا . بخارا سے وہ خوارزم پہنچا اور بظاہر دربار خوارزم کے یورتن کی حیثیت سے دس گیارہ سال علم و حکمت کی خدمت انجام دیتا رہا لیکن اندر ہی اندر وہ اس انقلابی تحریک کی تنظیم میں مصروف کار تھا .

اس دس سال کے عرصہ (٣٩٣ ـ ٤٠٣ھ) میں سلطان محمود ملتان اور دیگر ولایات ہندستان کی فتح میں مشغول تھا اور اس عرصہ میں

---

(١) عيون الأنباء في طبقات الأطباء ٢ : ٢

(٢) البيهقي: تتمة صوان الحكمة : ٤

(٣) الرد على المنطقيين : ١٤٤

داؤد والی ملتان کی تادیب (سنہ ۳۹۶ھ) اور کلی استیصال (سنہ ۴۰۱ھ) کے ذریعہ مشرقی سرحد کو باطنیہ کی ریشہ دوانیوں سے پاک کر لیا اتنے میں سنہ ۴۰۳ھ میں اسماعیلی خلیفۂ مصر کا سفیر تاہرتی غزنوی سلطنت میں آیا مگر سلطان کے حکم سے نیشاپور میں روک دیا گیا ۔ اس کی تلاشی لی گئی تو اسکے ہمراہ باطنی لٹریچر ملا جسے وہ اپنے دعاۃ میں تقسیم کرنے کے لیے لایا تھا۔ فقیہ ابو بکر محمد بن اسحاق کرّامی نے اس کا امتحان لیا تو معلوم ہوا کہ سفارت کا ڈھونگ ہی ڈھونگ تھا ۔ اصل مقصد کچھ اور تھا ۔ لہٰذا دارالسلطنت میں طلب کیا گیا وہاں حسن بن طاہر بن مسلم نے جو ایک جلیل القدر سید تھے اور جن کا خاندان مصر میں رہ چکا تھا اس کی اور پول کھولی ۔ ادھر خلیفہ القادر باللہ کا خفیہ مکتوب سلطان کے پاس آیا ہوا تھا ۔ بہرحال تاہرتی قتل کیا گیا ۔ عتبی نے جو اس واقعہ کا معاصر مؤرخ ہے اور چشم دید واقعہ نگار بھی، سفیر مصر کے آنے کی پوری تفصیل دیتا ہے[1] ۔

طاہر ہے ان واقعات کے بعد محمود کا باطنی دعاۃ بالخصوص اس تحریک کے ان کارناموں کی جانب سے جو خوارزم کے اندر اس انقلاب کے لیے اندر ہی اندر کوشش کررہے تھے چوکنا ہوجانا فطری تھا ۔ لہٰذا اس نے افاضل خوارزم کو اپنے دربار میں بلانے کے بہانے سے اس تحریک کے «خطرناک کارکن» کو غزنی میں نظربند کرالینا ضروری سمجھا ۔ آیندہ تاریخی واقعات نے اس بات پر مہرتوثیق ثبت کردی کہ یہ «خطرناک کارکن» شیخ بوعلی سینا کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا اور یہ کہ اس کی جانب سے سلطان کو جو خطرات تھے وہ بے بنیاد نہ تھے ۔

بہرحال شیخ بوعلی سینا، محمود کے قاصد (خواجہ حسین بن علی میکال) کے جرجانیہ پہنچنے سے پہلے ہی نکل بھاگا اور ایک بالکل غیر معروف اور دشوارگزار راستے سے جرجان روانہ ہوگیا ۔ مگر قابوس بن و شمگیر جس کی نیت سے وہ چلا تھا، اس کے جرجان پہنچنے سے کچھ دن پہلے

---

(۱) العتبی: تاریخ یمینی ۲۹۶ : ۲۹۹ نیز دیکھیے گردیزی : زین الأخبار: ۷۱

قتل ہوچکا تھا۔ نظامی عروضی سمرقندی راستے کی تکالیف کا ذکر کرتا ہے
کہ شدت تشنگی سے ابو سہل مسیحی کا درمیان راہ میں انتقال ہوگیا۔ شیخ
سخت جان تھا کسی نہ کسی طرح ابیورد پہنچ گیا[1]۔ جرجان پہنچ کر اسے معلوم
ہوا کہ قابوس جسکے پاس پناہ لینے وہ آیا تھا، مرچکا ہے تو اس خبر نے
اس کا دل توڑ دیا اور دہستان پہنچ کر وہ «مرض صعب» میں مبتلا ہوگیا۔
بہرحال کچھ دن تندرست ہونے کے بعد وہ جرجان میں مقیم رہا، مگر
سیاسی حالات نے ایک اور کروٹ لی، قابوس کے جانشین ملک المعالی
منوچہر نے سلطان محمود کی بالادستی تسلیم کرلی کچھ دن بعد سلطان کی
لڑکی سے اسکی شادی بھی ہوگئی۔ اب شیخ کے لیے جرجان میں رہنا
ناممکن ہوگیا۔ لہذا یہاں سے نکلنے پر مجبور ہوا اور رے پہنچا جو باطنیوں
کا ایک اور گڑھ تھا (ملاحظہ ہو محمود کا مکتوب بنام خلیفہ القادر باللہ
عباسی)۔ لیکن رے پر ہر آن محمود کے حملہ کا اندیشہ تھا جو بالآخر سنہ
۴۲۰ھ میں ہوکر رہا اس لیے وہاں سے بھی بھاگنے پر وہ مجبور ہوا۔ جیساکہ
اس کا شاگرد ابو عبید جوزجانی لکھتا ہے[2]۔

رے سے وہ پہلے قزوین اور پھر ہمدان پہنچا، جہاں مجدالدولہ
دیلمی کا دوسرا بھائی شمس الدولہ حکمراں تھا یہاں اس نے اپنی انقلابی
سرگرمیوں کو تیز سے تیز ترکردیا۔ اس سے لشکر اس کی جان کا
دشمن ہوگیا۔ اتنے میں شمس الدولہ نے وفات پائی اور اس کا بیٹا
سماءالدولہ اس کا جانشین ہوا۔ اس عرصے میں شیخ نے علاءالدولہ ابوجعفر
ابن کاکویہ والی اصفہان سے جو کھلا ہوا شعوبی تھا، خفیہ خط
کتابت شروع کی۔ وزیر تاج الملک کو خبر ہوئی تو اس نے قلعہ فردجان
میں قید کردیا۔ کچھ دن گذرے تھے کہ علاءالدولہ نے حملہ کیا تاج الملک
شکست کھاکر خود بھی اس قلعے میں پناہ گزیں ہوا۔ علاءالدولہ کے واپس
جانے پر تاج الملک نے شیخ سے مفاہمت کرنی چاہی مگر نہ ہوسکی۔

---

(۱) چہار مقالہ (گب میموریل سیریز): ۷۸
(۲) طبقات الأطباء ۲ : ۵

آخرکار کچھ دن بعد بھیس بدل کر شیخ، علاءالدولہ کے یہاں پہنچا اور آزادی سے اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی، اسکے نتیجے میں سلطان محمود اور علاءالدولہ کے درمیان لڑائیوں کا ایک غیر مختتم سلسلہ چھڑ گیا۔ محمود کی سطوت و شوکت کے مقابلے میں علاءالدولہ کی ہستی ہی کیا تھی مگر یہ شیخ ہی کا کارنامہ تھا کہ ممولے کو شاہین سے لڑا دیا اور اس طور سے بھڑایا کہ لشکر محمودی کے دانت کھٹے کردیے مگر شیخ کا کمال تھا کہ ہزیمتوں کے باوجود (جن میں شیخ کا اثاثہ حتی کہ کتابیں تک لٹ گئیں)[1] وہ محمود اور محمود کے بعد اس کے بیٹے مسعود کے مقابلے میں ڈٹا رہا۔

دنیا، بیکونن (Bikunın) اور کروپوٹکین (Kropotkin) کی انقلابی سرگرمیوں کو جانتی ہے مگر ابن سینا کی سرگرمیاں کچھ کم خطرناک نہیں تھیں اس لیے اگر محمود کی دور اندیشی نے سنہ ۴۰۳ھ ہی میں اس آفت روزگار کی اہمیت کا اندازہ لگاکر اس کی خطرناک سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھنے اور اسکی فتنہ پردازیوں کا سدباب کرنے کے لیے اسے جرجانیۂ خوارزم سے بلاکر غزنی میں شہر بند کرنا چاہا تو یہ بالکل فطری تھا۔ البتہ اس معاملے کو اہمیت نہ دینے کے لیے اس نے خوارزم کے سارے افاضل کو طلب کیا ابو نصر ابن عراق اور البیرونی کو کوئی اندیشہ نہ تھا لہذا وہ بطیب خاطر اسکے دربار میں پہنچے۔ سلطان کو بھی ان نجومی ہیئت‌دانوں کی چنداں ضرورت نہ تھی اس‌سے جلد ہی انہیں واپس کردیا گیا۔

یہ ہے پس منظر «چہار مقالہ» کی اس حکایت کا اور اس کی روشنی میں اسکے اندر کوئی استبعاد نظر نہیں آتا بلکہ حکایت فطری معلوم ہوتی ہے۔ تاریخ اور خود شیخ بوعلی سینا کی خود نوشت سوانح عمری اس کی تائید کرتی ہے۔ قدیم مؤرخین نے بھی اس کی صحت میں کسی شک و شبہ کا اظہار نہیں کیا۔ عہد حاضر میں (Ell.ot) اُسے حرف بحرف تسلیم کرتا ہے اس لیے اگر اس عاجز نے اس حکایت کے باب میں زخاؤ کی تقلید کے بجائے ایلیٹ کا اتباع کیا تو غالباً بیجا نہیں کیا۔

(۱) اخبار الدولة السلجوقیه : ٦

۲۰ - البیرونی کا سفر جرجانیہ :
مضـ[illegible]گار لکھتے ھیں : «البیرونی کا ۳۹۴ھ میں جرجانیہ پہنچنا کسی مأخذ سے ثابت نہیں ہوتا ۳۹۱ھ یا اس کے کچھ بعد سے ۴۰۰ ھجری تک البیرونی کا کسی مأخذ سے جرجانیہ پہنچنا ثابت نہیں ہوتا» لیکن میرا یہ خیال کسی خارجی مأخذ سے ماخوذ نہیں ھے بلکہ خود البیرونی کی اپنی تصانیف کی داخلی شہادت پر مبنی ھے۔ وہ «قانون مسعودی» میں لکھتا ھے کہ سنہ ۳۹۳ھ میں وہ جرجان میں موجود تھا جہاں اس نے دوچاند گہنوں کا مشاہدہ کیا تھا اور سنہ ۳۹۴ھ میں جرجانیہ میں تیسرے چاند گہن[1] کا۔ اس باب میں «قانون» کی شہادت حرف آخر کا درجہ رکھتی ھے۔

۲۱ - البیرونی اور ابن سینا کے مناظرے :
راقم نے عرض کیا تھا کہ غالباً دونوں میں علمی مناظرے سنہ ۳۹۲ اور ۳۹۴ھ سے پہلے شروع ہوگئے تھے۔ ڈاکٹر زخاؤ کا بھی تو انھوں نے یہی قول نقل کیا ھے : «بیرونی اور ابن سینا کے درمیان علمی مناظرہ بھی ہوا، جس کا ذکر بیرونی نے «آثار» میں کیا ھے۔ یہ ۳۹۰ - ۳۹۱ھ سے پہلے کا واقعہ ھے جبکہ ابن سینا ابھی بخارا میں تھا اور اس کی عمر ۱۸ سال کی تھی»۔

بہرحال میرا مأخذ خود «الآثار الباقیة» ھے جہاں البیرونی، شیخ کی رائے مناظرانہ رنگ میں پیش کرتا ھے :[2]

«وقد ذکرت ذلک فی موضع آخر ألیق به من هذا الکتاب و خاصة فی ماجری بینی وبین الفتی الفاضل ابی علی الحسین بن عبدالله بن سینا من المذاکرات فی هذا الباب»۔

اور چونکہ «الآثار الباقیہ» کا سال تصنیف ۳۹۰ھ ھے اس لیے یہ مناظرے ۳۹۰ھ سے قبل ھی شروع ہوگئے تھے۔ پروفیسر صاحب نے اس ضمن میں «تتمة صوان الحکمة» کے کچھ اقتباسات دیے ھیں۔ لیکن اس

(۱) البیرونی : قانون مسعودی ۲ : ۷۴۰ - ۷۴۱
(۲) الآثار الباقیہ۔ ۲۵۷

سے پیشتر یہ عاجز بھی ان مناظروں کا ایک مختصر تاریخی جائزہ دے چکا ہے جس کا اعادہ موجب تطویل ہوگا[1] .

۲۲ - ابونصر بن عراق کا سال وفات :

فاضل معترض میرے اس بیان کہ ابو نصر بن عراق کا سال وفات ۴۰۳ھ اور ۴۰۷ھ کے درمیان ہے . صواب سے دور اور غیر مستند قرار دیتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ اس کی وفات ۴۱۶ھ اور ۴۲۷ھ کے درمیان ہوئی .

اور اس کی تائید میں « تحدید نہایات الأماکن » کا ایک فقرہ پیش کرتے ہیں جس میں البیرونی نے اپنے کسی کرم فرما کے لیے « شیخ » کا لفظ استعمال کیا ہے : « لما کانت العقول محتاجة الی الاستمداد . . . فاخلق بی ان اعرض مایخطر بالبال . . . علی الشیخ » ان کا خیال ہے کہ یہ « الشیخ » ابو نصر بن عراق ہی ہے حالانکہ البیرونی اپنے استاد کی طرح تواضعاً بھی اپنے کرمفرماؤں کے لیے « الشیخ » کا لفظ استعمال کرتا ہے . جس رئیس کے نام پر اس نے « الاستیعاب بوجوہ الممکنة فی صنعة أصطرلاب » معنون کی تھی اسے بھی « الشیخ ایدہ اللہ » کہتا ہے حالانکہ وہ ابو نصر بن عراق نہیں تھا .

رہا جو کچھ میں نے عرض کیا تھا کہ ابو نصر بن عراق کا سال وفات ۴۰۳ اور ۴۰۷ھ کے درمیان ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ سنہ ۴۰۳ھ میں تو ابو نصر بن عراق جرجانیہ سے غزنی جاتا ہے اس لیے اسے زندہ ہونا چاہیے . سنہ ۴۰۷ھ میں فتح خوارزم کے موقع پر یا اسکے بعد بھی ابونصر بن عراق کا کوئی ذکر سننے میں نہیں آتا (یہ میرا سنہ ۱۹۶۱ء میں قیاس تھا) اس لیے وہ مردہ ہوگا لہذا میں نے یہ رائے قائم کی تھی کہ اس کا سال وفات ۴۰۳ھ اور اور ۴۰۷ھ کے درمیان ہے .

لیکن اب میں نے پچھلی لا ادریت کہ « نہ اس کا سال وفات ہی صحیح طور پر متعین ہے » اور سابق عدم تعین کہ « ابو نصر بن عراق کا سال وفات

---

(۱) معارف (ستمبر ۱۹۶۰ء) : ۱۸۹ - ۱۹۱

۴۰۳ھ اور ۴۰۷ھ کے درمیان ہے» دونوں سے رجوع کرلیا ہے . اب میری قطعی رائے ہے کہ « ابو نصر بن عراق کا سال وفات ۴۰۸ھ ہے . سبکی کی «الطبقات الشافعیہ» میں امام محمود بن محمد بن العباس بن ارسلان الخوارزمی کے تذکرے میں درج ہے کہ انھوں نے آلِ حلدون میں خوارزم کی تاریخ بھی لکھی تھی. آگے چل کر سبکی نے اس تاریخ کا ایک اقتباس بھی نقل کیا ہے جو خوش قسمتی سے ابو نصر بن عراق کے تذکرے پر مشتمل ہے اور جس میں اس کا سال وفات بھی متعین طور پر مذکور ہے .

محمود نے جرجانیہ حسب تصریح گردیزی ۵ صفر سنہ ۴۰۸ھ کو فتح کیا تھا[1] اس لیے ابو نصر بن عراق بھی سنہ ۴۰۸ھ میں قتل ہوا . بہر حال فاضل معترض کی یہ نئی دریافت کہ « اسکی وفات ۴۱٦ھ اور ۴۲۷ھ کے درمیان ہوئی» صحت سے دور ہے اور ان کی عجلت پسندی کا نتیجہ ہے .

فاضل معترض نے یہ بھی لکھا ہے کہ شیخ (بوعلی سینا) کا علم ہیئت کی ترقی میں کیا حصہ ہے جس کا بیرونی نے اعتراف کیا ہو الا یہ کہ بیرونی کی محو ملیح کو اعتراف کا درجہ دے دیا جائے . اس کا جواب « ریاضیات شفا » سے مل سکتا ہے مگر یہ ایک مستقل بحث ہے اور مستقل شرح و بسط کی مقتضی .

[۱۱ / ۱۲ / ۱۹٦۳م]

* * *

(۱) گردیزی: زین‌الأخبار : ۷۴

# صدرالدین علی بن ابی‌الفرج البصری

ڈاکٹر مختارالدین احمد*

عربوں کا عہدِ عباسی، دواوین کی ترتیب اور شعری مجموعوں کی تالیف کے لیے بڑا سازگار ثابت ہوا. «المفضلیات»، «الأصمعیات»، «کتاب الإختیارین» «جمهرة أشعارالعرب»، «مختارات أشعارالعرب»، «منتهی‌الطلب من أشعارالعرب» اور دوسرے مجموعوں سے جن کی فہرست طویل ہے قطع نظر، ایسے مجموعوں کی تعداد بھی خاصی ہے جن کی طرح ابو تمام (متوفی ۲۳۱ھ) نے ڈالی. وہ پہلا شخص ہے جس کے انتخاب کردہ مجموعے کے لیے «الحماسة» کا نام تجویز ہوا. اس سے پہلے عام طور پر قصیدوں کے انتخابات اور مجموعے بنا کرتے تھے، اب مقطعات کی باری آئی اور چھوٹے چھوٹے قطعے بھی مجموعوں میں جگہ پانے لگے. ابو تمام کا انتخاب بڑا مقبول ہوا. اس نے شعری مجموعے کی ترتیب کی ایک نئی راہ نکالی اور خود اس منزل کا مسافر اور میرکارواں بھی بنا. دنیائے ادب کو اس طرح ایک اچھے شاعر سے بڑھ‌کر اچھا نقاد، اور شعری حسن کو پرکھنے والا ایک فن‌کار مل گیا. اس کی اپنی شاعری سے زیادہ اس کی تنقیدی صلاحیتوں اور اس‌کے حسن ذوق کو سراہا گیا اور اسکے انتخاب کو ایک بڑا ادبی کارنامہ سمجھا گیا، اسی لیے صدیوں سے یہ معمول رہا ہے کہ «دیوان ابو تمام» سے «حماسۃ ابو تمام» کو کہیں زیادہ اہمیت دی جاتی ہے. ابوتمام کی اس کتاب پر جس قدر علماء نے‌کام کیا ہے اور جس قدر شروح اور حواشی لکھے ہیں اسے بتانے کے لیے ایک علیحدہ مضمون چاہیے.

---

(*) ڈاکٹر مختارالدین احمد، ریڈر ادارۂ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی علی‌گڑھ.

«حماسة» کے لغوی معنی جنگ میں شجاعت و بسالت کے ہیں۔ ابو تمام کی کتاب کا پہلا باب «باب الحماسة» ہے اسی مناسبت سے پوری کتاب کا نام «الحماسة» ہوگیا۔ بعد کے لوگوں میں بھی یہ سنت جاری رہی، البحتری (م ۲۸٤ھ)[1] جو خود ابو تمام کا شاگرد اور اس کا خوشہ چیں تھا، پہلا شخص ہے جس نے اسکی پیروی کی اور اپنے عمل میں کچھ نئی راہیں پیدا کیں، «حماسۂ ابو تمام» میں کل دس ابواب تھے۔ اس نے بڑھاکر ۱۷٤ ابواب یا عنوانات قائم کیے اور ان کے تحت اشعار جمع کیے۔ اس میں قطعات بھی زیادہ تعداد میں جمع کیے ہیں جن کی تعداد ۱٤٥٤ تک پہنچتی ہے۔ ابن الشجری (م ٥٤٢ھ) کے پیش نظر «حماسۂ ابوتمام» تو تھا ہی ممکن ہے «حماسۂ بحتری» بھی ہو[2]۔ اس نے افراط و تفریط سے بچ کر درمیانی راہ نکالی، بحتری کے یہاں ابواب بہت زیادہ تھے اور اس سے قارئین کو آسانی اور دلچسپی کے بجائے وحشت ہوتی ہے۔ اس نے اپنے یہاں مختصر لیکن ضروری ابواب رکھے اور یوں یہ مختصر سی کتاب بہت مقبول ہوئی۔

یہ چند وہ حماسے ہیں جو ہمارے سامنے شائع ہوکر آچکے ہیں لیکن یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ حماسوں کی تعداد ختم ہوگئی۔ ذیل میں چند اُن حماسوں یا اُن مجموعوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو «حماسہ» کہلاتے ہیں، یا اس طریقے پر لکھے گئے ہیں، اس لیے کہ بعد کے دور میں «حماسہ» ہر اس مجموعے کو کہنے لگے جس میں قطعات جمع کیے گیے ہوں، خواہ

---

(۱) Brockelmann, *Geschichte der Arabischen Literature* (Leiden, 1937-1949). i, 7°

(۲) لیکن یہ یقینی نہیں، بحتری کے حماسے کی کم یابی کا یہ حال رہا ہے کہ عبدالقادر البغدادی (متوفی ۱۰۹۳ھ) تک کو یہ کتاب نہیں ملی تھی اور نہ انھیں اس کتاب کا پتا تھا: «ولم نسمع أن للبحتري حماسة» الخزانة (۳ : ٥۹۱)۔ خود بیسویں صدی میں جب لویس شیخو الیسوعی اسے شائع کر رہے تھے تو لایڈن کے ایک نسخے کے علاوہ انھیں دنیا بھر میں کوئی دوسرا نسخۂ مقابلے کے لیے نہ مل سکا۔

اس کا نام حماسه هو یا نه هو. ان میں بعض اب حوادث کے هاتھوں فنا هوچکے هیں اور بعض جو زمانه کے دست برد سے محفوظ رہ گئے هیں، کتب خانوں کے گوشوں میں پڑے هوئے هیں اور اب تک دن کی روشنی کو ترس رهے هیں.

حماسة أعلم شنتمری:

ابو الحجاج یوسف بن سلیمان بن عیسی الأعلم النحوی الشنتمری (۴۱۰—۴۷۶ھ)[1] نے بھی ایک حماسه مرتب کیا تھا جو «حماسة أعلم شنتمری» کے نام سے مشہور هے. راقم قطعی طور پر کچھ کہنے سے قاصر هے که یه کوئی مستقل حماسه هے یا جس طرح شیخ نائل مرصفی نے کیا هے[2] شنتمری نے بھی «حماسة ابو تمام» کی ترتیب حروف تہجی پر کرکے اس کی شرح کردی هے جیسا که صلاح الدین الصفدی (م۷۶۴ھ) کے ایک بیان سے معلوم هوتا هے[3].

(۱) حالات کے لیے دیکھیے ابن خلکان: وفیات الأعیان (۶: ۷۹)؛ المقری: نفح الطیب (۲: ۴۷۱) نشر دوزی؛ ابن بشکوال: الصلة رقم: ۱۳۹۱ (طبع کودیرا)؛ Brockelmann, GAL i, 377 نیز دیکھیے Brockelmann کا مقاله «الأعلم» در دائرة المعارف الإسلامیه (۲: ۳۲۱) جهاں ان کی کئی موجوده تصانیف کا بھی ذکر هے.

(۲) اس کتاب کے دو نسخے دارالکتب المصریه قاهره میں محفوظ هیں.

(۳) «شرحَ الحماسة شرحاً مطولاً و رتبَ الحماسة علی کل باب منها علی حروف المعجم» (نکت الهمیان: ۳۱۳). استاذ مکرم پروفیسر عبد العزیز المیمنی کا بھی یہی خیال هے: «وحماسة الأعلم الشنتمری وهی حماسة أبی تمام هذه بعد ترتیبها علی الحروف» دیکھیے ان کا مقاله: «ماذا رأیت بخزائن البلاد الإسلامیة» (حیدر آباد، ۱۳۶۰) ص ۸ جو انهوں نے دائرة المعارف العثمانیه حیدر آباد کی ایک مجلس منعقده ۱۳۵۷ میں پڑھا.

Brockelmann نے الأعلم الشنتمری کے ذکر میں اس کی تصانیف کے ذیل میں «الحماسه» کا اس طرح ذکر کیا هے جس سے معلوم هوتا هے که وه اسے اس کتاب کا مصنف سمجھتا هے

ابن خلکان کا خیال یہ ہے کہ الشنتمری نے « الحماسة » کی شرح لکھی تھی جس کا ایک نسخہ ان کے پاس تھا[1].

حاجی خلیفہ نے ان کا ذکر شارح حماسۂ ابو تمام کی حیثیت سے کیا ہے[2]. دارالکتب المصریہ کے فہرست نگار[3] نے حماسۂ ابو تمام کے یک نسخے کا ذکر کیا ہے جو بروایت الأعلم الشنتمری ہے اور جس کی ترتیب حروف تہجی پر رکھی گئی ہے اس میں سب سے پہلے قیس بن الخطیم کا مندرجہ ذیل مقطوعہ درج ہے :

ثارت علیا والحطیم فلم أضع وصیة أشیاخ جعلت ازاء ھا

یہ نسخہ مغربی خط میں أحمد بن عبداللہ بن سلیمان نے ۵۹۷ ھجری میں لکھا ہے. الشنتمری کتابوں کی شرحیں لکھنے میں خاص دل چسپی رکھتے تھے. ان کی تصانیف میں « شرح دیوان المتنبی » ، «شرح الشعراء الستة» ، «شرح شواهد کتاب السیبویہ » جس کا نام «تحصیل عین الذھب فی معدن جوھر الأدب فی علم مجازات العرب» ہے . علی الترتیب برلین ، پیرس ، آکسفورڈ کے کتاب خانوں میں محفوظ ہیں اس لیے یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ اس نے ابو تمام کے « دیوان الحماسة » کی ہی شرح کی ہو لیکن ترتیب بدل دی ہو اور شرح کے ضمن میں کچھ ایسے قطعات کتاب میں نقل کیے ہوں جو حماسۂ ابو تمام میں موجود نہ ہوں. استاذ مکرم مولانا عبدالعزیز المیمنی نے بہت عرصہ ہوا میری توجہ اس بات کی طرف منعطف کرائی تھی کہ اس کا بھی امکان ہے کہ اندلس اور مغرب کے دوسرے حصوں میں « حماسۂ ابوتمام » کی جو روایت پہنچی ہو وہ متداول روایت سے مختلف ہو. عبدالقادر البغدادی (متوفی ۱۰۹۳ ھ) صاحب «خزانة الأدب» نے متعدد مقامات پر اس حماسے

---

(۱) «و غالب ظنی أنه شرح الحماسة فقد کان عندی شرح الحماسة للشنتمری فی خمس مجلدات ، و قد غاب عنی الآن من کان مصنفه وأظنه هو والله أعلم ، و قد أجاد فیه» . وفیات (٦ : ٧٩).

(۲) کشف الظنون ۱ : ٦٩٢ (استانبول ، ۱۹٤۱ م )

(۳) الفهرس (۳ : ۸۹)

کا اس طرح ذکر کیا ہے جیسے یہ صرف «حماسۂ ابوتمام» کی شرح نہ ہو، بلکہ خود ایک مستقل کتاب ہو. بعد کو Brockelmann نے البغدادی کی تقلید کی ہے[1].

(۱) ابو زبید الطائی کا یہ شعر:

لیتَ شعری و أین منی لیتٌ ... إن «لیتاً» و إنّ «لوّاً» عناءُ

نقل کرکے بغدادی لکھتے ہیں[2]:

«البیت من قصیدة لأبی زبید الطائی، أورد منها الأعلم فی باب النسیب من حماسته ستة أبیات» اور پھر انہوں نے وہ چھ شعر نقل کردیے ہیں. اگر أعلم الشنتمری نے حماسۂ ابو تمام کی صرف ترتیب درست کی ہوتی تو یہ اشعار جو ابو تمام کے حماسہ میں نہیں ہیں حماسۂ شنتمری میں کہاں سے آجاتے؟

(۲) عصام بن عبیدة الزِّمانی کا یہ شعر[3]:

أبلغ أبا مسمعٍ عنی مغلغلةً ... و فی العتاب حیاة بین أقوامِ

نقل کرکے لکھا ہے:

«أوردها أبو تمام[4] والأعلم الشنتمری و صاحب الحماسة البصریة[5] فی حماستهم[6]» یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ عبد القادر البغدادی «حماسۂ أعلم الشنتمری» کو «حماسۂ ابو تمام» اور «حماسۂ بصریه» کی طرح ایک مستقل کتاب اور علیحدہ مجموعه تصور کرتے ہیں.

---

(۱) «و ذکر عبدالقادر البغدادی «کتاب الحماسة» للأعلم فی مصنفه» (بروکلمان: دائرة المعارف الاسلامیه ۲ : ۳۲۱)

(۲) البغدادی: خزانة الأدب (۳ : ۳۸۲).

(۳) صدرالدین علی البصری: الحماسة البصریه (۲ : ۲۲) مرتبه مختارالدین احمد طبع دائرة المعارف حیدرآباد، ۱۹٦٤

(٤) أبو تمام: الحماسة (۳ : ۷۷)

(٥) الحماسة البصریة (۲ : ۲۲)

(٦) البغدادی: خزانة الأدب (۳ : ۳٤٥)

(۳) اسی طرح دوسری جگہ لکھا ہے[1]: «أوردها أبو تمام فی الحماسة للحصین بن الحمام و أوردها الأعلم الشنتمری فی حماسته أیضاً» ترتیب بدلنے والے اور شرح کرنے والے کو کسی قطعے یا قصیدے کو حذف کرنے کا اختیار نہیں ہوتا اور اوپر کی عبارت سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ ابوتمام اور أعلم الشنتمری دونوں کے حماسوں میں جو یقیناً علیحدہ علیحدہ اور مستقل کتابیں ہیں یہ قطعہ موجود ہے۔

(٤) ایک جگہ لکھتے ہیں[2] «هو من أبیات أوردها أبو تمام فی باب المراثی و أوردها الأعلم أیضاً فی حماسته»۔

(٥) لیس من مات فاستراح بمیْتٍ إنما المیتُ میت الأحیاءِ[3]

اس پر بغدادی لکھتے ہیں[4]: «أوردها الأعلم والشریف الحسینی فی حماستیهما»

(٦) لحافی لحاف الضیف والبرد برده ولم یلهنی عنه غزال مقنعُ

اس پر بغدادی رقم طراز ہیں: «و کلهم روی هذا الشعر لمسکین[5] إلا الجاحظ و الأعلم الشنتمری فإنهما نسباه إلی کعب بن سعد الغنوی»[6].

(۱) ایضاً (۳ : ٦٠٥) (۲) ایضاً (۳ : ٦٠٥)

(۳) یہ شعر عدی بن الرعلاء الغسانی کی طرف منسوب ہے۔ (بحتری: الحماسة : ۳۱۱) اور یاقوت الحموی (معجم الأدباد ٤ : ۲٦۹) اس شعر کو صالح بن عبد القدوس کی ملکیت بتاتے ہیں۔ مولانا عبدالعزیز المیمنی کا بھی یہی خیال ہے دیکھیے سمط اللآلی : ۸ حاشیہ رقم ٥

(٤) البغدادی: خزانة الأدب (٤ : ۱۸۷)

(٥) صاحب «خزانة الأدب» کا یہ بیان کہ جاحظ اور الشنتمری کے سوا سب لوگوں نے یہ قطعہ مسکین الدارمی کی طرف منسوب کیا ہے، صحت سے دور ہے۔ الحماسة البصریه (۲ : ۲٤۷) میں یہ عقبة بن مسکین الدارمی اور حماسۂ ابو تمام (٤ : ۱۲۰) میں عتبہ بن بجیر کی طرف منسوب ہے۔ اس قطعے کی نسبت عروة بن الورد کی طرف بھی ہے اور اس کے دیوان میں موجود ہے (دیوان رقم : ۱۷)۔ جاحظ اور الشنتمری کے علاوہ شریشی نے بھی اسے الغنوی کی طرف منسوب کیا ہے دیکھیے: الشریشی : شرح المقامات (۲ : ۲۳٦) (٦) الخزانة (۲ : ۱۸۰)

(۷) حماسۂ أعلم الشنتمری میں کم از کم ایک باب ایسا بھی ھے جو حماسۂ أبو تمام کیا، کسی حماسے میں موجود نہیں اور وہ آخری باب، «باب القصر و الکبر» ھے، یوں بھی اس کتاب میں ایسے زیادات ھیں جن کا حماسۂ ابو تمام میں پتا نہیں۔

بہرحال اصل کتاب کے مطالعه کے بغیر یقینی طور پر کچھ کہنا مشکل ھے، لیکن یه ضرور ھے که اگر الشنتمری نے «حماسۂ ابو تمام» کی صرف شرح کی ھوتی یا ترتیب بدلی ھوتی تو بغدادی اس کا ذکر کہیں تو کرتے۔ الشنتمری کا حماسه ان کی نظر سے گزرا ھے، اس سے فائده اُٹھایا ھے اور اس کے حوالے دینے میں وہ مجموعی انداز ایسا اختیار کرتے ھیں جس سے یقین ھوتا ھے که وہ اسے «حماسۂ ابو تمام» سے علحده ایک مستقل کتاب سمجھتے ھیں' یه دوسری بات ھے که الشنتمری کے پیش نظر «حماسۂ ابو تمام» رھی ھو اور اس سے اس نے بہت فائده اٹھایا ھو. اگر ایسا ھے تو اس میں حماسۂ شنتمری کی کیا تخصیص ھے تقریباً سارے حماسوں میں «حماسۂ ابو تمام» کے قطعات موجود ھیں۔

اس حماسے کا ایک بہت قدیم، صحیح، اور اھم نسخه[1] دارالکتب المصریه قاھره (ادب: ٩٤) میں موجود ھے جس کی کتابت ۵۹۷ ھ میں ھوئی ھے۔ خیر الدین الزرکلی نے الشنتمری کے «شرح دیوان الحماسة» کے ایک نسخے کا پتا بتایا ھے جس کی کتابت ۵۱۳-۵۱٤ ھ میں ھوئی ھے اور کتب خانۂ احمدیه تیونس میں محفوظ ھے[2]. حماسۂ شنتمری کی ایک شرح کا بھی پتا چلا ھے[3] یه بارھویں صدی ھجری کے ایک مغربی عالم ابن زا کور[4] الفاسی (م ۱۱۲۰ ھ) نے «شرح الحماسة الشنتمری» کے نام سے دو جلدوں میں کی ھے جس کا ایک ناقص الطرفین نسخه خط مغربی میں امیر طاھر الجزائری، حفید امیر

---

(۱) فهرس دارالکتب المصرية (٤ : ۸۹) قاھره، ۱۹۲۷م

(۲) الزرکلی : الأعلام (۹ : ۳۰۸)

(۳) عبد العزیز المیمنی : یادداشت سیاحت ممالک اسلامیه (قلمی)۔

(٤) Brockelmann, *GAL* Suppl. ii, 684

عبد القادر الجزائری کے کتب خانۂ دمشق میں موجود ہے۔ یہ نسخہ استاذ المیمنی کی نظر سے بھی گذر چکا ہے[1]. غالباً خود الشنتمری نے بھی اپنے حماسے کی شرح لکھی تھی۔

الحماسة للشاطبی :

اس حماسے کے مؤلف ابو عامر محمد بن یحییٰ بن خلیفة بن ینّق الشاطبی الأندلسی النحوی (٤٨٢ھ—٥٤٧ھ) ہیں[2]. یہ اندلسی ادیب ہیں اور شاطبہ کے رہنے والے۔ ان کی تصانیف میں «ملوک الأندلس و الأعیان والشعراء بها»، «مجموعة خطب» اور «الحماسة» ہیں۔ آخر الذکر کتاب کے کسی نسخے کی اطلاع نہیں ملی ہے اور نہ کسی ادبی کتاب میں اس کا حوالہ نظر سے گررا۔

الحماسة للشمیم الحلی :

مصنف ابوالحسن علی بن الحسن بن عنتر بن ثابت النحوی اللغوی متوفی ٦٠١ھ جو شمیم الحلی کے نام سے مشہور ہیں[3].

یاقوت الحموی، مصنف سے ٥٩٤ھ میں ملا تھا، وہ کہتا ہے کہ ابو تمام کے حماسے کا ذکر آیا تو انہوں نے کہا: ابو تمام نے تو اپنے حماسے میں سارے شعرائے عرب کے اشعار جمع کردیے ہیں لیکن میں نے تو صرف اپنے اشعار سے ایک پورا حماسہ تیار کردیا ہے۔ وزیر جمال الدین ابن القفطی نے بھی تفصیل سے اس کے حالات لکھے ہیں اور اس کے حماسے کا ذکر کیا ہے۔ حاجی خلیفہ کے یہاں بھی اس حماسے کا ذکر ملتا ہے اس سے

(١) عبدالعزیز المیمنی : ماذا رأیت بخزائن البلاد الإسلامیه : ٩

(٢) حالات کے لیے دیکھیے : ابن الأبار : التکملة ١٩٨ ؛ سیوطی : بغیة الوعاة : ١١٢ ؛ فتح بن خاقان : قلائد العقیان : ١٨٦ ؛ البغدادی : إیضاح المکنون فی الذیل علی کشف الظنون (١ : ٤٢١) اور الأعلام (٨ : ٧).

(٣) ان کے حالات معجم الأدباء (٥ : ١٣٠) ؛ ابن العماد : شذرات الذهب (٥ : ٤) ؛ وفیات الأعیان (٣ : ٢٦) : القفطی : إنباه الرواة (٢ : ٢٤٣) تحقیق محمد ابوالفضل ابراهیم (قاهره، ١٩٥٢) دیکھنا چاهیے۔

یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا حماسہ ۱٤ ابواب پر مشتمل تھا[1]. تعجب نہیں ابواب بعینہ وہی ہوں جو ابو تمام کے یہاں ہیں. ابن خلکان نے لکھا ہے[2] کہ اس حماسے میں دس ابواب تھے[3].

الحماسة المغربیه :

اس کے مصنف جمال الدین ابو الحجاج یوسف بن محمد بن ابراہیم الأنصاری البیاسی الأندلسی متوفی ٦٥٣ ھ ہیں[4]. ان کی ولادت بیاس (اندلس) ٥٧٣ ھ میں ہوئی، موصوف اندلس کے مشہور عالموں میں تھے، نظم و نثر پر بڑی بھر پور قدرت رکھتے تھے. عرب کی تاریخ، وقائع و ایام پر بڑی گہری نظر تھی. صاحب افریقہ کے لیے ایک کتاب «الإعلام بالحروب الواقعة فی صدر الإسلام» لکھی تھی جس میں حضرت عمر فاروق کی شہادت سے ہارون الرشید کے عہد تک کے واقعات درج ہیں[5]. «شرح رسالة ابن حریق» (ابن حریق[6] کے حاشیہ بر «الجمل» الزجاجی کی شرح ہے).

(۱) کشف الظنون (۳ : ۱۱٦)

(۲) وفیات الأعیان (۳ : ۲٦)

(۳) اس مصنف کی ایک دوسری کتاب «الأنیس فی غرر التجنیس» کا بھی پتا چلا ہے. اس کا ایک نسخہ دار الکتب المصریہ میں موجود ہے (الفهرس ٤ : ۲۹) «کشف الظنون» میں اس کا نام «أنیس الجلیس فی التجنیس» ہے.

(٤) حالات کے لیے دیکھیے ابن خلکان : وفیات الأعیان (٦ : ۲۳٦) طبعة محی الدین عبدالحمید؛ مقری : نفح الطیب (۲ : ۲۱۳)؛ ابن العماد : شذرات الذهب (٥ : ۲٦۲)؛ Brockelmann, *GAL* 1, 124, Suppl 1, 588.

(٥) ابن خلکان لکھتے ہیں «رأیت هذا الکتاب فطالعته و هو فی مجلدین أجاد فی تصنیفه» (وفیات ٦ : ۲۳٦). اس کا ایک نسخہ دار الکتب المصریہ میں محفوظ ہے (الفهرس ٥ : ۳۳) مزید دیکھیے :

Horovitz, *Mitteilungen der Seminars fur Orientaliche Sprachen* Vol. X p. 22

(٦) (متوفی سنه ٦۲۲ ھ) حالات کے لیے دیکھیے : ابن الزبیر الغرناطی : صلة الصلة رقم : ٦٦۳، اس کتاب کا ایک نسخہ مکتبة الزاویة الحمزیة، تطوان (مغرب) میں محفوظ ہے.

اور « تذکرة العاقل و تنبیه الغافل »[۱] کے علاوہ انہوں نے متقدمین و متأخرین شعراء کے کلام کا ایک مجموعہ بھی مرتب کیا تھا جو « الحماسة المغربیه » کے نام سے مشہور ھے اور چونکہ بیاس ان کا وطن ھے اس لیے اس مناسبت سے ان کے حماسے کا نام « الحماسة البیاسیة » بھی ھے۔ یہ کتاب دو جلدوں پر مشتمل ھے[۲] جس کی تصنیف تیونس میں (شوال ٦٤٦ ھ میں) ھوئی، اس میں « حماسۂ ابو تمام » کے طرز پر جاهلی، مخضرم، اسلامی مولدین اور مشرق اور اندلس کے محدثین شعراء کے بہترین اشعار انتخاب کرکے جمع کیے ھیں، اس میں اندلس کے شعراء کا بھی کلام درج ھے[۳]. ابن خلکان کی نظر سے یہ حماسہ گزرا تھا اور دو تین مقامات پر اس نے اس کا ذکر بھی کیا ھے اور اس سے فائدہ بھی اٹھایا ھے[٤]. ابن العماد بھی اس کتاب سے اپنی واقفیت کا اظہار کرتا ھے[٥].

(۱) وفیات الأعیان (۲ : ۳۲٦) ابن خلکان نے نام « تذکیر العاقل» اور « تذکرة العاقل» دونوں لکھا ھے اور اس سے کئی مقامات پر استفادہ کیا ھے اور کتاب کی طویل عبارتیں بھی نقل کی ھیں دیکھیے (٦ : ۱۱٦) اور (٦ : ۱۲۷).

(۲) کشف الظنون (۳ : ۱۱٦)، ابن العماد نے بھی دو جلدوں کا ذکر کیا ھے شذرات (٥ : ۲٦۲).

(۳) کشف الظنون (۱ : ٦۹۲) طبع استانبول.

(٤) ابن اللبانة کے ذکر میں ابن خلکان لکھتے ھیں : «رأیت فی کتاب الحماسة التی صنفها یوسف البیاسی» (۲ : ۳٥)، پھر ابو یعقوب یوسف بن عبد المؤمن کے ترجمے میں لکھتے ھیں : «و قال البیاسی فی حماسته» (۲ : ۲۷۳). البیاسی کے ترجمے میں وہ لکھتے ھیں : «و رأیت له أیضاً کتاب الحماسة فی مجلدین و قد قرئت النسخة علیه و علیها خطه، کتبه فی أواخر شهر ربیع الآخر سنة خمسین و ستمائة. و قال فی آخر الکتاب : و کان الفراغ من تألیفه و ترتیبه بمدینة تونس، حرسها الله تعالی فی شوال سنة ستّ و أربعین و ستّ مائة».

(٥) ابن العماد: شذرات الذهب (٥ : ۲٦۲). ابن خلکان نے اس حماسے کی تمهید اور مختلف ابواب سے کچھ قطعات نمونے کے طور پر کئی صفحوں میں درج بھی کیے ھیں. وفیات الأعیان (٦ : ۲۳٦)، (٦ : ۲۳۷-۲٤۱).

اس حماسے کا ایک مکمل نسخہ جس میں ابو تمام ، بحتری ، ابن السید البطلیوسی کا بھی خاصہ کلام موجود ہے کتب خانۂ سلطان محمد فاتح استانبول میں موجود ہے اس کا خط مغربی ہے اوراق ۱۰۹ سطور فی صفحہ ۲۵ مکتوبہ ۶۱۸ھ[۱] اس کتاب کے کچھ اجزا کتب خانۂ گوتھا (مشرقی جرمنی) میں بھی محفوظ ہیں[۲].

التذکرة السعدیة :

اس کے مؤلف محمد بن عبدالرحمن بن عبد المجید العبیدی[۳] ہیں جو کم از کم ۷۰۲ھ تک ضرور زندہ تھے . یہ جاهلی ، اسلامی ، مخضرمی اور مؤلف کے عہد تک کے متأخرین شعراء کے کلام کا نہایت نفیس انتخاب ہے . اصل مأخذ یہ تین حماسے ہیں : « حماسة ابو تمام » ، « حماسة ابن فارس » اور « حماسة ابو هلال العسکری » اس کے علاوہ محدثین میں مؤلف نے ابو نواس، زهیر المصری وغیرہ کے اشعار کا اضافہ کیا ہے. اس کتاب میں یزید بن معاویہ کے بہت سے اشعار ملتے ہیں .

کتاب مندرجہ ذیل ۱٤ ابواب پر مشتمل ہے :

۱۔ الحماسة والافتخار ، ۲۔ الأدب والحکم والأمثال ، ۳۔ النسیب ، ٤۔ المدح والإستجداء والإستعطاف و التقاضی ، ٥۔ المراثی ، ٦۔ الهجاء

---

(۱) کتاب خانۂ فاتح رقم : ٤۰۷۹ اس پر ایک مضمون *MFO* Vol. v, p. 505 میں شائع ہوا ہے . اسی نسخے کے حاشیے پر « صفوة الأدب » جس کا ذکر آگے آرہا ہے درج ہے .

(۲) گوتھا رقم : ۱۳ دیکھیے دیباچہ حماسۂ بحتری از لویس شیخو؛ بروکلمان : تأریخ الأدب العربی ( ۱ : ۸۲ )

(۳) Brockelmann نے کتاب کا پورا نام « التذکرة السعدیة فی الأشعار العنبیه » لکھا ہے . مصنف کے متعلق اس کے پاس بالکل معلومات نہیں اس نے صرف مصنف کا نام لکھ دینے پر اکتفا کیا ہے *GAL* Suppl, II, p. 901 اس کتاب پر ایک مضمون کا حوالہ بھی یہاں درج ہے جو *WZKM* Vol. XXVI p. 81 میں شائع ہوا ہے .

۷۔ الأخوانيات، ۸۔ التهانی، ۹۔ الإعتذار، ۱۰۔ الصفات، ۱۱۔ المعانبات والشمانة من حوادث الزمان و الصبر عليها، ۱۲۔ الملح، ۱۳۔ الأشياء المتفرقة، ١٤۔ الدعاء.

مؤلف کا طریقۂ کار یہ ہے کہ ہر باب میں وہ سب سے پہلے «حماسۂ ابو تمام» سے اپنے پسندیدہ قطعات نقل کرتے ہیں، اس کے بعد ابو هلال العسکری اور ابن فارس اللغوی کے حماسوں سے اشعار کا انتخاب دیتے ہیں، اس کے بعد اس باب میں ابو تمام، بحتری اور متنبی کے اشعار اور پھر آخر میں اپنے عہد تک کے دوسرے شعراء کا انتخاب کلام درج کرتے ہیں.

یہ کتاب نہایت دلچسپ اور مفید ہے اور شائع کرنے قابل ہے اس لیے کہ اس کے اہم مأخذوں میں دو کتابیں «حماسۂ عسکری» اور «حماسۂ ابن فارس» کا آج وجود نہیں، اس کے علاوہ یہ صرف ان دونوں حماسوں کا خلاصہ یا انتخاب نہیں بلکہ خود مؤلف نے اپنے زمانہ تک کے شعراء کے اشعار بڑی تلاش و جستجو سے جمع کیے ہیں، اور بعض نئے ابواب کا اضافہ بھی کیا ہے. اس کتاب کا ایک نسخہ خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا مکتوبہ ۷۰۲ ھ چھوٹی تقطیع کے ۲٤۰ اوراق (سطور: ۱۷) پر ایاصوفیہ (استانبول) کے کتب خانے میں محفوظ ہے، رقم: ۳۸۲۱[1].

صفوة الأدب و ديوان العرب:

مصنف ابو العباس أحمد بن عبد السلام الکورانی ہیں[2]. موصوف کو متقدمین اور متأخرین کے اشعار کثرت سے یاد تھے، انہوں نے ایک مجموعہ «حماسۂ ابو تمام» کی وضع پر ترتیب دیا ہے. ابن خلکان کے عہد میں یہ

---

(۱) عبد العزیز المیمنی: یادداشت سیاحت ممالک اسلامیہ. (قلمی)

(۲) Brockelmann نے صرف کتاب اور مصنف کا نام درج کردیا ہے حالات اور نسخے کی تفصیلات پیش نہیں کی ہیں ہاں یہ لکھا ہے کہ کتاب خانۂ فاتح میں اس کتاب کا اختصار موجود ہے *GAL* Suppl. II, p 916

اس نسخے پر ایک مضمون *MFO*, Vol. V, p. 505 میں شایع ہوا ہے.

کتاب عام تھی. وہ لکھتے ہیں کہ یہ کتاب اہل مغرب میں اُسی طرح مقبول تھی جسطرح «حماسۂ ابو تمام» مشرق میں. وہ اس مجموعے کے حسن ترتیب و انتخاب کے معترف ہیں[1] . مصنف نے یہ مجموعہ یعقوب بن یوسف بن عبد المؤمن القیسی الکوفی صاحبِ بلاد المغرب (متوفی ٥٩٥ ھ)[2] کے نام معنون کیا تھا[3]. مصنف چھٹی صدی ہجری سے تعلق رکھتے ہیں اور انہوں نے اپنے حماسے میں اپنے زمانہ تک کے شعراء کے اشعار درج کیے ہیں یہ کتاب ، «الحماسة المغربیه» نسخۂ کتاب خانۂ سلطان محمد فاتح (رقم ٤٠٧٩) کے حاشیے پر منقول ہے . اس نسخے کا خط مغربی ہے ، تعداد اوراق ۱۰۹ سطور ۱۷ اور سال کتابت ٦١٨ھ ہے[4] .

حماسۂ أبوهلال العسکری :

عربی زبان کے مشہور مصنف أبو هلال العسکری (متوفی ۳۹۵ھ) کی تالیف ہے. اس کا ذکر بدر الدین عینی[5] اور حاجی خلیفه[6] نے کیا ہے . صاحب «مجموعة المعانی» کو یہ کتاب ملی تھی اور اس سے اس نے فائدہ بھی اٹھایا تھا[7] .

---

(١) «جمع کتاباً یحتوی علی فنون الشعر علی وضع «الحماسه» لأبی تمام الطائی ، و سماه «صفوة الأدب و دیوان العرب» و هو کثیر الوجود بأیدی الناس ، و هو عند أهل المغرب کالحماسة عند أهل المشرق» (وفیات الأعیان ۲ : ۳۷٥ ، ٦ : ١٣٦ طبعة محی‌الدین عبدالحمید )

(٢) وفیات الأعیان (٦ : ٤) ؛ نفح الطیب (٢ : ٧٣٨) ؛ (٢ : ١١٨٨)؛ الأعلام (٩ : ٢٦٧) .

(٣) « وله ألف ابو العباس أحمد بن عبد السلام الجراوی کتابه الذی سماه « صفوة الأدب و دیوان العرب » فی مختار الشعر و هو مجموع ملیح أحسن فی اختیاره کل الإحسان» (وفیات الأعیان ٣ : ٢٢٨) .

(٤) عبد العزیز المیمنی : یاد داشت سیاحت ممالک اسلامیه (قلمی) . اس نسخے پر ایک مضمون *MFO* Vol. v. p. 505 میں شائع ہوا ہے .

(٥) العینی : شرح شواهد المغنی (٤ : ٥٩٨) .

(٦) کشف الظنون (٣ : ١١٦) طبع فلوگل ، (١ : ٦٩٣) طبع استانبول .

(٧) « کذا رواه أبو هلال العسکری فی کتابه الحماسة الذی جمعه » (مجموعة المعانی : ١١٣) .

یہ کتاب، «التذکرة السعدیة» کے بہت اہم مأخذوں میں ہے اور اس میں بہت سے مندرجات و معلومات «حماسۂ ابو ہلال» سے ماخوذ ہیں.

الحماسة المحدثة لابن فارس :

یہ أحمد بن فارس بن زکریا اللغوی متوفی ۳۶۹ھ[1] کی اس قدر اہم کتابوں میں ہے کہ ابن ندیم[2] نے اس کتاب کے علاوہ، اس کی کسی اور تصنیف کا ذکر نہیں کیا. اس میں قدماء کے کلام سے صرفِ نظر کرکے متأخرین کے اشعار کے انتخاب کی طرف توجہ کی گئی ہے، اس حماسے کا ذکر یاقوت الحموی[3] نے بھی کیا ہے، متأخرین کے یہاں جو اس کتاب کا ذکر ملتا ہے[4]. اس کا مأخذ غالباً «معجم الأدباء» ہی ہے. «تذکرة السعدیة»

(۱) حالات کے لیے دیکھیے : ابن خلکان : وفیات (۱ : ۱۰۰) نشر محی الدین عبدالحمید؛ یاقوت الحموی : معجم الأدباء (٤ : ۸۰ - ۹۸) طبع الرفاعی؛ الزرکلی . الأعلام (۱ : ۱۸٤) دوسرا ایڈیشن؛ عمر رضا کحالة : معجم المؤلفین (۲ : ٤۰) جہاں ان بہت سے مصادر کا ذکر ہے جن میں ابن فارس کے حالات ملتے ہیں. نیز دیکھیے محمد بن شنب کا مقالہ «ابن فارس» در دائرة المعارف الاسلامیہ (۲ : ۲٤۷)؛ اور «الصاحبی» اور «مقائیس اللغة» کے تنقیدی ایڈیشن کے مقدمے جو علی الترتیب محب الدین الخطیب اور الأستاذ عبدالسلام محمد هارون کے لکھے ہوئے ہیں.

(۲) ابن الندیم : الفهرست : ۸۰

(۳) یاقوت الحموی: معجم الأدباء (۲ : ۸) طبع مارگولیتھ، (٤ : ۸۰) طبع الرفاعی. یاقوت نے اس کا نام «کتاب الحماسة المحدثة» لکھا ہے. ابن فارس کا وہ طویل مکتوب جو اس نے ابو عمرو محمد بن سعید الکاتب کو لکھا ہے «حماسات المحدثة» کے متعلق اس کے نظریے کی وضاحت کرتا ہے، الثعالبی کی «یتیمة الدهر» (۲ : ۲۱٤ - ۲۱۸) میں موجود ہے، وہیں سے الاستاذ محمد عبدالسلام هارون نے «مقائیس اللغة» (مقدمة الناشر : ۱٥ - ۲۰) میں اور محب الدین الخطیب نے «الصاحبی» کے مقدمے میں نقل کیا ہے.

(٤) اسماعیل پاشا : ایضاح المکنون فی الذیل علی کشف الظنون (۱ : ٤۲)

کے اہم مأخذوں میں یہ کتاب بھی رھی ھے ۔ اس کا ، (یا حماسۂ ابو تمام، شرح ابن فارس کا؟) ایک نسخہ کتب خانۂ مشہد ایران، میں موجود ھے[1] ۔

حماسۂ ابن المرزبان :

ابوبکر (یا ابو العباس) محمد بن خلف المرزبان الدمیری البغدادی،[2] اس کے مؤلف ھیں جو زبیر بن بکار (متوفی۲۵٦ھ) اور الرّمادی (متوفی۲٦۵ھ) کے شاگرد ھیں ۔ ان کے تلامذہ میں ابو عمر و بن حیوۃ قابل ذکر ھیں ۔ ابن المرزبان کا سال وفات ۳۰۹ھ ھے ۔ ان کے حماسے کا ذکر صرف یاقوت الحموی کے یہاں دیکھنے میں آیا[3] ۔ یاقوت کے علاوہ کوئی اور مصنف اس کتاب کا ذکر نہیں کرتا ۔ ان کی تصانیف میں « وصف الفارس » ؛ « وصف السیف » ، اور « وصف القلم » کا ذکر ملتا ھے ۔ کہا جاتا ھے کہ اس نے پچاس سے زائد کتابیں فارسی سے عربی میں ترجمہ کیں ۔ ان کی پانچ کتابوں کا ذکر Brockelmann نے کیا ھے جن میں تین کتابیں مخطوطے کی شکل میں اب بھی محفوظ ھیں ۔ « تفضیل الکلاب » قاھرہ سے ۱۳٤۱ میں شائع ھوچکی ھے[4] ۔

حماسۂ خالدّیین :

کتاب کا اصل نام « الأشباہ و النظائر من شعراء المتقدمین و الجاھلیة و المخضرمین » ھے جو « حماسة الخالدّیین » کے نام سے مشہور ھے جسے اعمالِ موصل کے ایک قریہ « خالدّیہ » کے رھنے والے دو بھائیوں ، ابوبکر محمد اور ابو عثمان سعید نے مل کر مرتب کیا ھے ۔ اکثر ادبی

---

(۱) فہرست کتاب خانۂ مشہد، ایران (۳ : ٦) تہران ۱۳٤۵ھ.

(۲) السیوطی : بغیة الوعاۃ : ۱۰۳ ؛ حاجی خلیفه : کشف الظنون (۲ : ۲۰۱۳) طبع استانبول ؛ کحالہ معجم المؤلفین (۱۲ . ۱۳) ؛ یاقوت : معجم الادباء (۱۹ : ۵۲)؛ الخطیب البغدادی : تأریخ بغداد (۵ : ۲۳۷) .

(۳) معجم الأدباء (۷ : ۱۰۵) الجزء المنحول .

(٤) بروکلمان : تاریخ الأدب العربی (۲ : ۲۳۹) مترجمه الدکتور عبدالحلیم النجار (دار المعارف ، مصر).

علمی کام دونوں بھائیوں نے مل کر کیے اور ان کی ساری تصانیف پر دونوں کے نام درج رہے۔ ان کے سالہائے ولادت و وفات کے متعلق قطعی طور پر کچھ معلوم نہیں، لیکن یہ دیکھتے ہوئے کہ یہ دونوں بھائی، چوتھی صدی ہجری کے ربع اول کے بعض مصنفین و رواۃ ابن الخیاط النحوی (م ۳۲۰ھ) ابن درید (م ۳۲۱ ھ) جحظة البرمکی (م ۳۲٤ھ) النوبختی (م ۳۲۷ھ)، قدامة بن جعفر (م ۳۳۷ھ) الصولی (م ۳۳۵ھ) اور التنوخی (م ۳۸۳ ھ) وغیرهم سے روایتیں نقل کرتے ہیں یہ کہا جاسکتا ہے کہ دونوں بھائی تیسری صدی کے اواخر اور چوتھی صدی کے پہلے عشرے میں پیدا ہوئے ہوں گے۔ ابوبکر، اپنے بھائی ابو عثمان سے عمر میں بڑے تھے ان کی وفات ۳۸۰ ھ میں ہوئی۔ ابو عثمان کے سال وفات میں اختلاف ہے Brockelmann نے ۳۵۰ ھ اور یاقوت الحموی نے ۳۷۱ھ لکھا ہے۔ یہ تاریخیں صحیح نہیں ہو سکتیں۔ اس لیے کہ ۳۸۰ ھ تک ان کا زندہ رہنا ثابت ہے، ابن شاکر الکتبی نے «فی حدود الأربع مائة» لکھا ہے[1]۔ قیاس غالب ہے کہ چوتھی صدی ہجری کے عشرۂ دهم میں ان کی وفات ہوئی ہوگی[2]۔

«الأشباه والنظائر» کی ترتیب دوسرے حماسوں اور اس قسم کے مجموعوں سے مختلف ہے اس کا پہلا باب، «باب الحماسة» ہی نہیں۔ اور یہ مجموعہ عنوانات کے تحت صرف شعروں کا انتخاب ہی نہیں جیسا کہ دوسرے حماسوں کے مرتبین کا معمول ہے بلکہ مؤلفین نے یہ انداز اختیار کیا ہے کہ کچھ اشعار لکھ کر ان شعروں کے ہم معنی شعر پیش کرتے ہیں اور پھر اس پر گفتگو کرتے ہیں، شعراء کے کلام پر موازنہ کرتے ہیں اور پھر ہر شعر کے بارے میں یہ بتاتے ہیں کہ شاعر نے یہ مضمون کہاں سے لیا ہے اور کن کن شعراء سے وہ مستفید ہوا ہے، شجاعت و بسالت کا ذکر آیا تو اس مضمون کے بہترین اشعار جمع

(۱) *GAL Suppl. I, 41*، معجم الأدباء (۱۱ : ۲۰۸)، فوات الوفیات (۱ : ۳۵۰)۔

(۲) الدکتور سامی الدهان نے سال وفات ۳۹۰ ہجری لکھا ہے۔ (مقدمة التحف والهدایا)

کردیں گے ، کسی کے هجویه اشعار یاد آگئے تو کثرت سے سپرد قلم کریں گے . مراثی کے مضمون پر اسی قسم کے شعر درج کریں گے ، نسیب کا ذکر هے تو ویسے هی اشعار انتخاب کرکے لائیں گے اور اس طرح همیں «باب الحماسة» ، «باب الهجاء» ، «باب المراثی» ، «باب النسیب» کا لطف آجاتا هے . کہیں پر شرح کی ضرورت پڑی تو شرح شروع هوجائے گی ، تلمیح یا کوئی قصه طلب بات سامنے آگئی تو اس کا بیان هونے لگا ، کسی لڑائی کا نام آیا تو ایام عرب کے دفتر کھلنے لگے ، «ابن الدُّمینة» کے شعر پسند آگئے تو اس کا دیوان کھڑا کردیا ، انهی وجوه سے لوگ اس کتاب کو حماسوں میں شمار نہیں کرتے . لیکن اصل یه هے که ان مصنفین نے حماسه ترتیب دینے کی ایک نئی راه نکالی هے اور پرانے طریقے کو خیر باد کہه دیا هے . سابق حماسوں میں مؤلف ، صرف اشعار منتخب کردیتا تها ، اس کی اپنی رائے کا پتا نہیں چلتا تها ، اشعار کی تشریح نہیں هوتی تهی ، تلمیحوں اور شرح طلب رموز و نکات کا بهید نہیں کهلتا تها ، اس کمی کو انهوں نے محسوس کرکے اس پر پوری توجه دی هے اور اپنے مجموعے کو مفید سے مفید تر بنانے کی کوشش کی هے .

«الأشباه» کے نسخے کتب خانۂ عاشر آفندی ، (استانبول) رقم : ۹۷۱ مکتوبه ۶۰۳ھ، کتب خانۂ اسعد آفندی سلیمانیه رقم : ۲۹۳۳ اور دارالکتب المصریه رقم : ۱۷۰۹ میں محفوظ هیں . اس کی پہلی جلد ڈاکٹر سید محمد یوسف نے ۱۹۵۸ء میں قاهره سے شایع کردی هے .

الحماسة البصرية :

مطبوعه حماسوں کے علاوه ، ان حماسوں میں جو ابهی تک منظرعام پر نہیں آئے هیں ، سب سے زیاده اهمیت «الحماسة البصريه» کی هے اس کا مصنف غیر معروف سہی ، لیکن کتاب گم نام نہیں ، قدیم علماء نے جس قدر اس سے فائده اُٹهایا هے اور دورِ حاضر کے مستشرقین اور دوسرے محققین نے جس قدر حوالے اس حماسے کے دیے هیں اتنے کسی غیر

(۱) المختار من شعر ابن الدمينة ؛ تحقيق مختار الدين أحمد مقدمه : ۱۳ ـ ۱۴

مطبوعہ حماسہ کے دیکھنے میں نہیں آئے بلکہ اگر یہ کہا جاے کہ «حماسۂ ابو تمام» کے بعد یہ دوسرا مشہور حماسہ ہے جسے دنیا جانتی ہے اور جس سے علماء کثرت سے فائدہ اُٹھاتے ہیں تو بے جا نہ ہوگا. قدماء میں ابن شاکر الکتبی (م٧٦٤ھ)[١]، عبد القادر البغدادی (م ١٠٩٣ھ)[٢]، بدر الدین العینی (م ٨٥٥ ھ)[٣]، جلال الدین السیوطی (م ٩١١ ھ)[٤]، ابن الأکفانی (متوفی ٧٤٩ ھ)[٥] اور خضر الموصلی[٦] (م١٠٠٧ھ) نے اپنی کتابوں میں اس کے حوالے دیے ہیں. عصر حاضر کے پچاسوں علماء نے تخریجات و اختلاف روایات کے لیے اپنی کتابوں میں اس سے فائدہ اُٹھایا ہے اور انہیں اس کتاب سے بڑی مدد ملی ہے. جن اصحاب کے لیے یہ کتاب لکھی گئی اور جن کے نام معنون کی گئی ہے. وہ بڑی جلیل القدر ہستیاں تھیں، اسی طرح جن لوگوں نے اس کتاب پر تقریظات لکھی ہیں. ان کی علمی اہمیت بھی مسلم ہے

«الحماسة البصرية» کے مؤلف صدر الدین علی بن أبی الفرج البصری نے سب سے پہلے اس مجموعے کو ٦٤٧ ھ میں مرتب کیا اور الملک الناصر

(١) الکتبی: عیون الأخبار (حوادث ٢٨٠ھ) نسخۂ کتاب خانۂ ماربرگ، جرمنی

(٢) خزانة الأدب میں ذیل کے مقامات پر «الحماسة البصرية» کا ذکر آیا ہے: ١: ١٠، ٣٥٦، ٤٥٠، ٤٥٥، ٤٩٢، ٢: ٣٦٩، ٥٤٤ــ٣: ١٢١، ٣٤٥ ـ ٣٥١، ٥٦٥، ٤: ٥٢٣، ٥٨٩. (المیمنی: إقليد الخزانة)

(٣) العینی: المقاصد النحوية فی شرح شواهد شروح الألفية ٢: ٢٣٥، ٣: ٤٦

(٤) السیوطی: شرح شواهد المغنی: ٢٢، ٣١، ٦٢، ١٦٤، ١٥٥، ١٧٥، ١٨٨، ٢٤١، ٣٢٠.

(٥) ابن الأکفانی: إرشاد القاصد إلى أسنى المقاصد: ٢٢، اس حوالے کے لیے میں پروفیسر A. S Tritton کا ممنون ہوں. مصنف کا نام محمد بن إبراهيم بن ساعد المصری الأنصاری ہے (Brockelmann, *GAL*. Suppl II, 169) یہ کتاب قاہرہ سے ١٩٠٠ ھ میں شایع ہوچکی ہے.

(٦) خضر بن عطاءالله الموصلی: کتاب الإسعاف (نسخۂ کتب خانۂ خدابخش بانکی پور) میں متعدد مقامات پر الحماسة البصريه کا ذکر ہے. اس کتاب کا پورا نام «کتاب الإسعاف فی شرح شواهد القاضی والکشاف» ہے. *GAL* i, 509

صلاح الدنیا والدین ابو المظفر یوسف بن الملک العزیز بن الملک الظاہر »
کے نام معنون کیا، بعد میں ایک مدت تک اس میں ترمیم و اضافے کا
عمل جاری رہا، اب کی مؤلف نے تمہید میں خلیفۂ عباسی المستعصم باللہ کے
نام کا بھی اضافہ کردیا، یہ عمل کب ہوا اس کے متعلق کچھ نہیں کہا
جاسکتا، لیکن یہ تبدیلی اس قدر گہری تھی کہ اب کتاب بہت حد تک
بدل گئی ہے، پہلے یہ کتاب صرف ایک جلد پر مشتمل تھی اب اسے
مؤلف نے دو جلدوں میں تقسیم کردیا، قطعات کی تعداد میں بھی بہت کچھ
اضافے کیے، گو کہیں کہیں سے بعض قطعات نکال بھی دیے. پہلی روایت،
مصنف کے کام کی ابتدا تھی اس لیے اس میں اسقام خاصے نظر آتے ہیں،
بہت سے ضروری اور اہم قطعے غائب تھے، درج شدہ قطعوں میں بھی بہت
سے قابل انتخاب اشعار چھوڑ دیے تھے، شاعروں کی طرف انتساب بھی
کہیں کہیں غلط تھا، کوئی قطعہ اگر کئی شاعروں کی طرف منسوب ہے
تو پہلے صرف ایک شاعر کا نام وہاں درج تھا. اب دوسری روایت میں کہیں
کہیں دوسرے شعراء کے نام بھی درج کردیے ہیں، اس میں ابواب بھی کم تھے
اب اس میں بھی اضافہ کردیا ہے، غرض کہ مصنف نے دوسری روایت میں
جو زیادہ مکمل ہے ساری کمیوں کو پوری کرنے اور دوسرے نقائص کو
دور کرنے کی کوشش کی ہے. اس لیے آخری روایت ہی اصل کتاب
ہے اور اسی کو مصنف نے بھی مستند سمجھا اور یہی روایت تمام دنیا میں
اس وقت شائع اور مروج ہے.

مصنف :

ہمارا مصنف اس قدر گم نام ہے کہ تاریخ و تذکرے کی کسی
کتاب میں اس کے حالات دیکھنے میں نہیں آئے. یہ بات افسوس ناک
بھی ہے اور حیرت انگیز بھی، علمائے سیر و تواریخ نے تو ایسے اشخاص تک
کے حالات محفوظ کردیے ہیں جن کی کوئی خاص اہمیت نہیں، ہمارے
مصنف نے تو دو کتابیں بھی لکھی ہیں اور اپنے زمانے میں اسکی اپنی
اہمیت کم نہ تھی، وہ امراء و ملوک کا پروردہ تھا، اس نے متعدد سلاطین

و وزرا کا زمانہ پایا اور ان سے ان کے تعلقات رہے، اگر صلاح الدین ابو المظفر یوسف بن الملک العزیز (٦٢٧ - ٦٥٩ ھ) حلب کا امیر اور الملک الظاہر رکن الدین بیبرس النجمی البندقداری (٦٥٨ - ٦٧٢ ھ) مصر کا بادشاہ تھا، تو المستعصم باللہ (٦٠٩ - ٦٥٦ ھ) خلافتِ عباسیہ کا خاتم اور آخری حاشیں. اس کی کتاب کے تقریظ نگاروں میں السلطان الملک الناصر داؤد بن عیسیٰ بن عیسیٰ بن ابی بکر بن ایوب (٦٠٣ - ٦٥٦ ھ) بادشاہ تھا تو مؤید الدین ابراہیم بن القمطی (٥٩٤ - ٦٥٨ ھ) وزیر، پھر اس عہد کے مشہور علماء و مؤرخین: ابن العدیم (٥٨٦ - ٦٦٠ ھ)، کمال الدین محمد بن طلحۃ الشافعی (٥٨٢ - ٦٥٢ ھ)، شہاب الدین یحیی بن محمد بن القیسرانی (م؟) ، ابن مالک النحوی (٦٠٠ - ٦٧٢ھ) ، ابن عمرون (٥٩٦ - ٦٤٩ھ) وغیرہم سے اس کے ذاتی تعلقات تھے مصنف کا زمانہ وہ ہے جس میں مؤرخین اسلام نے مشہور تاریخی کتابیں لکھیں، ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں متعدد تاریخی تذکرے مرتب ہوئے اور ان کی ذیلیں لکھی گئیں. لیکن یہ سب صدرالدین علی کے ذکر سے خالی ہیں. یہی نہیں کہ اس کے معاصرین نے بے اعتنائی کی، بلکہ بعد کے مؤرخین نے بھی اسے درخورِ اعتنا نہ سمجھا، ابن خلکان اور بعض دوسرے مصنفین، صاحبِ بصریہ کے معاصرین میں ہیں، ابن العدیم اس کا دوست ہے اور اس کی تقریظ «البصریۃ» پر موجود ہے، قطب الدین الیونینی (م ٦٢٧) کی «ذیل مرآۃ الزمان» ٦٨٨ کے واقعات سے شروع ہوکر ٦٦٠ھ پر ختم ہوتی ہے جبکہ ہمارے مصنف کی وفات ٦٥٩ھ میں ہوئی ہے. یونینی کے والد «الملک الناصر» کے دربار سے متعلق تھے اور اس کتاب میں ان کے عہد کے حالات تفصیل سے درج ہیں لیکن حیرت ہوتی ہے کہ مصنفِ «البصریۃ» کا کہیں استطراداً بھی ذکر نہیں. یہی حال سبطِ ابن الجوزی کی «ذیل مراۃ الزمان» کا ہے. ابن أیاس (م ٩٣٠ھ) نے الملک الناصر کے آخری عہد کے حالات، مغول کا حلب پر حملہ، بادشاہ اور اسکے درباریوں کا قتل، یہ سارے واقعات تفصیل سے لکھے ہیں، حد یہ کہ دربار کے جو علماء اور شعراء قتل ہوئے. ان کے نام تک لکھ دیے ہیں لیکن صدر الدین کا وہاں بھی

ذکر نہیں ملتا ، سیوطی اپنی کتابوں میں « حماسة البصریہ » کے حوالے دیتے ہیں لیکن ان کی کتابیں بھی ان کے ذکر سے خالی ہیں ۔

مصنف کے متعلق چند باتیں جو معلوم کرسکا ہوں وہ ذیل میں درج کی جاتی ہیں ۔ دمشق اور بصرے میں اس کا قیام ثابت ہے ، اس زمانے کے متعدد ملوک و امراء سے اس کے ذاتی تعلقات تھے اور ان میں سے بعضوں کی مصاحبت میں وہ عزت اور آسودگی کی زندگی گزار رہا تھا ، امیر حلب صلاح الدین ابو المظفر یوسف بن الملک العزیز بن الملک الظاهر (٦٢٢ھ ـ ٦٥٩ھ) کے ساتھ وہ مدتوں رہا ، اس زمانے میں اس نے « الحماسة البصرية » حاجی خلیفه[١] کے بیان کے مطابق ٦٤٧ھ میں مرتب کیا اور اس کے نام سے معنون کیا[٢]، بعد میں وہ اس میں ترمیم و اضافہ کرتا رہا ، اب کی مرتبہ اس نے امیرالمؤمنين المستعصم بالله (٦٠٩ ـ ٦٥٦ھ) کا نام بھی دیباچے میں درج کردیا[٣] . اس کی دوسری تصنیف جس کا اب تک پتا چل سکا ہے وہ « المناقب العباسية و المفاخر المستنصرية »[٤] ہے جو عباسیوں کے دور کی ایک

(١) کشف الظنون . (١: ٦٩٣)

(٢) مؤلف دیباچے میں لکھتا ہے : « و بعد فإنه لما كانت المجاميع الشعرية صقال الأذهان ولأنواع المعانى كالترجمان . و كان مولانا الملك الناصر صلاح الدنيا و الدين ابو المظفر يوسف بن الملك العزيز بن الملك الطاهر ــ لا زال نافذ الأوامر مى كل نجد و غائر ــ لهجاً باشعار العرب التى هى ديوان الأدب توخيت فى تحرير مجموع يحتوعلى قلائد اشعارهم و غرر أخبارهم . . » ( الحماسة البصرية ١ : ٢ ) .

(٣) « و أدام الله أيام سيدنا مولانا الإمام المفترض الطاعة على جميع الأنام أبى احمد المستعصم بالله أمير المؤمنين و خليفة رب العالمين » (الحماسة البصرية ١ : ٢)

یہ سطریں پہلی روایت میں موجود نہیں . اسی لیے نسخۂ عاشر آفندی جو پہلی روایت پر مبنی ہے ان سطور سے خالی ہے ۔

(٤) اس کتاب کا واحد قلمی نسخہ کتب‌خانۂ ملیؔ پیرس میں راقم کی نگاہ سے گزرا ہے اس کا نمبر ٤١٤٤ ہے اس پر REI بابت ١٩٣٨ میں ایک مضمون شایع ہوا ہے ۔ اس کتاب کے کسی دوسرے نسخے کی اب تک کوئی اطلاع نہیں ہے ۔

مختصر تاریخ ہے جسے اس نے الملک الظاہر رکن الدین بیبرس البندقداری الصالحی النجمی (۶۵۸ ـ ۶۷۲ ھ) کے نام معنون کیا ہے . جن امراء کا وہ متوسل تھا اور جن علماء نے اسکی کتاب پر تقریظیں لکھی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے معاصرین میں بہت اونچا درجہ رکھتا تھا .
زندگی کی اور حالات کا علم نہیں، وفات کے متعلق یہ معلوم ہے کہ وہ حلب میں ابو المظفر یوسف کی رفاقت میں زندگی گزار رہا تھا کہ ھلاکو نے ۶۵۹ ھ میں حلب پر حملہ کیا ، الملک الناصر قتل کردیا گیا اور اس کے ہم نشینوں کے ساتھ ہمارا مصنف بھی موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا . اس کا سال وفات ۶۵۹ ھ (بقول حاجی خلیفہ ۶۵۶ھ) ہے ، سال ولادت معلوم نہیں لیکن اس لحاظ سے کہ مدتوں وہ امراء اور ملوک کے ساتھ رہا پھر یہ کہ اس کے معاصرین عام طور پر وہی ہیں جن کی وفات ساتویں صدی ہجری کے ساتویں یا آٹھویں عشرے میں ہوئی ہے ، قیاس چاہتا ہے کہ مصنف کی ولادت بھی چھٹی صدی ہجری کے اواخر یا ساتویں صدی کے بالکل اوائل میں ہوئی ہوگی .

«تاریخ بغداد» ، مصنفہ ابن الدبیثی (۵۵۸ ـ ۶۳۷ ھ) میں علی بن أبی الفرج نام کے دو اصحاب کا ذکر ملتا ہے . اول الذکر تو کسی طرح ہمارا مصنف نہیں ہوسکتا وہ ہمارے مصنف سے قدیم معلوم ہوتا ہے . آخر الذکر کے متعلق بھی یقین کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے ، یہ بات قابل ذکر ہے کہ دونوں کا نام «علی» ہے دونوں کے باپ کا نام «ابوالفرج» دونوں کی کنیت «ابو الحسن» ہے اور دونوں بصرہ کے رہنے والے ہیں ، یہی ساری باتیں ہمارے مصنف میں بھی مشترک ہیں ، ہاں ہمارے مصنف کے یہاں کسی عرف کا پتا نہیں چلتا اس کی دونوں تصانیف میں بھی اس کے نام کے ساتھ عرف نہیں ہے اور جہاں جہاں اس کا ذکر پایا جاتا ہے وہ بھی عرف کے بغیر ، لیکن «تاریخ بغداد» کے دونوں اصحاب، نام کے ساتھ عرف بھی رکھتے ہیں ، ایک «ابن الدباب» دوسرے «ابن کبه» . قابل ذکر بات یہ ہے کہ ہمارے مصنف کا لقب صدرالدین ہے اور ان اصحاب کے ترجموں میں یہ لقب نہیں ملتا .

ہم ذیل میں «تأریخ بغداد» سے ان دونوں اصحاب کے ترجمے نقل کرتے ہیں[1]:

(الف) «علی بن أبی الفرج بن أبی المعالی أبوالحسن یعرف بابن الدباب، من أهل باب البصرة سمع أبا محمد محمد بن أحمد بن المادح وروی عنه سمع منه أصحابنا».

(ب) «علی بن أبی الفرج بن جعفر البصری الأصل، البغدادی المولد والدار، أبوالحسن یعرف بابن كبة، سمع أباالفتح محمد بن عبدالباقی بن سلیمان المعروف بابن الطبی و روی عنه سمعنا منه شیئاً یسیراً قرأت علی أبی الحسن علی بن أبی الفرج البصری أخبركم أبو الفتح محمد بن عبد الباقی بن أحمد سلمان قراءةً علیه و أنت تسمع فأقرّ به قال أنا أبو عبدالله مالك بن أحمد بن علی قراءةً علیه قال أنا أبوالحسن أحمد بن محمد بن موسی بن الصلت قال أنا أبو إسحاق إبراهیم بن عبدالصمد الهاشمی قال أنا الحسین بن الحسن المروزی قال أنا عبد الله بن المبارك والفضل بن موسی قال أنا عبید الله بن سعید بن أبی هند عن أبیه عن ابن عباس قال قال رسول الله صلی الله علیه و سلم :نعمتان مغبون فیهما كثیر من الناس الصحة و الفراغ».

الحماسة البصرية کے مآخذ و مصادر:

مصنف نے «حماسۂ بصریه» کی تمہید میں صرف ایک کتاب سے استفادہ کا صراحةً ذکر کیا ہے اور وہ خالدیین کی «الأشباه و النظائر من شعراء المتقدمين و الجاهلية و المخضرمين»[2] ہے. اصل کتاب میں بھی ایک مقام پر اس کا ذکر موجود[3] ہے. اس کتاب کا صراحةً اور کہیں ذکر نہیں ملتا لیکن قرائن مؤید ہیں کہ «بصریه» کا حماسۂ ابو تمام کے بعد سے بڑا مأخذ یہی

---

(۱) راقم پروفیسر F. Krenkow کا ممنون ہے کہ اپنی مشغولیت اور شدید علالت کے باوجود ابن الدبیثی کی «تأریخ بغداد» کے ایک قلمی نسخے سے یہ ترجمے انہوں نے خود نقل کر کے بھیجے. افسوس ہے یہ مرض، مرض الموت ثابت ہوا اور انہوں نے کیمبرج ہی میں ۱۹۵۳ میں انتقال کیا.

(۲) الحماسة البصرية (۱ :۲) تصحیح: مختار الدین احمد (حیدرآباد، ۱۹٦٤).

(۳) «وقال ابن أم حزنة.. و رواها الخالدیان لمالك بن نويرة و ليست له» (البصرية ۱ : ۲٤۹).

خالدیین کا حماسه هے. راقم کے اندازے کے مطابق ۱۰۰ سے زائد قطعے وهیں سے منقول هیں، بیسیوں کمیاب قطعے جن کا ذکر کہیں اور نہیں ملا اسی کتاب سے لیے گئے هیں. اشعار سے قطع نظر بعض مقامات پر عنوان کی عبارت نثر بھی بغیر، یا معمولی اختلاف کے ساتھ «بصریه» کے مصنف نے «حماسهٔ خالدیین» سے نقل کردیے هیں[1].

«حماسهٔ بصریه» کا دوسرا اهم مأخذ «حماسهٔ ابو تمام» هے، ایک جگه کتاب میں بھی اس کی صراحت ملتی هے[2]. حماسهٔ ابو تمام سے کس حد تک همارے مصنف نے اخذ کیا هے اس کا اندازه اس امر سے هوسکتا هے که صرف باب الحماسة میں کوئی چالیس قطعات «حماسهٔ ابو تمام» سے ماخوذ هیں.

تیسری کتاب جس کا ذکر صراحةً موجود هے «دیوان سلم الخاسر» هے[3].

جاحظ، صاحبِ بصریه کے محبوب مصنفوں میں هے اور اس کا ذکر متعدد مقامات پر آیا هے، لیکن یه کہیں نہیں پتا چلتا که اس کی کیا کتابیں مصنف کے پیش نظر تھیں، اس بات کی تحقیق کے لیے جاحظ کی تقریباً تمام مطبوعه کتابیں دیکھیں. یقین غالب هے که «کتاب الحیوان» سے یقینی طور پر اس نے فائده اُٹھایا هے. ابھی سلم الخاسر کے «دیوان» کا ذکر کیا گیا هے. اس عبارت سے معلوم هوتا هے که یه قطعه دیوان میں تو نہیں لیکن جاحظ نے اسکی طرف منسوب کیا هے، یه قطعه جاحظ کی «کتاب الحیوان» میں سلم الخاسر کے نام سے موجود هے[4]. یه قطعه، کسی اور مأخذ کا کیا ذکر، خود جاحظ کی کسی کتاب میں میری نظر سے نہیں گذرا. اسی طرح «باب خرافات العرب»[5] میں بعض قطعے

(۱) الحماسة البصرية (۱ : ۵۳) و (۲ : ۳۲۹)؛ الحماسة الخالديين: ۸۷، و ۱۳۱ (نسخة استاذ الميمني).

(۲) «و نسبها أبو تمام إلى أبان بن عبدة وليست له» (البصرية ۱ : ۸)

(۳) وقال سلم الخاسر: «تبدت . . . أثرالورس» و قد نسبها الجاحظ إليه وليست في ديوانه».

(٤) الجاحظ: كتاب الحيوان (۳ : ۹۰) البصرية (۱ : ۱٦۱).

(۵) البصرية (۲ : ۳۹۵ - ٤۰۱).

« کتاب الحیوان » هی سے ماخوذ هیں[١] . شبرمة بن الطفیل کے ایک قطعے کو جاحظ کی سند پر مصنف نے ابن الطثریه کی طرف منسوب کیا ہے[٢]. یه قطعه کتاب الحیوان » میں موجود ہے اور ابن الطثریة هی کے نام پر درج[٣] هے .

عمر بن أبی ربیعه کی طرف منسوب ایک مشهور قطعه[٤] :

قالت و عیش أخی و حرمة والدی    لأنبهن الحی إن لم تخرج

متعدد مصادر میں اس کی طرف منسوب هے[٥] بعضوں نے جمیل بن معمر العذری کی طرف بھی منسوب کیا هے[٦]. یه قطعه همارے مصنف نے عبید بن أوس الطائی کی طرف منسوب کیا هے . اس شاعر کی طرف انتساب صرف «کتاب الحیوان»[٧] میں ملتا هے کسی اور مأخذ میں یه انتساب دیکھنے میں نہیں آیا. ابو البلاد الطهوی کا قطعۀ نونیه[٨] اور اس کے متعلق خبر کا مأخذ بھی ممکن هے « کتاب الحیوان » هی هو[٩] .

أمیة بن ابی الصلت کا قطعه «صریرا»[١٠] «کتاب الحیوان» هی سے ماخوذ هے[١١]، عبارت نثر بھی وهیں سے لی گئی هے. « کتاب الحیوان» میں اس قطعے

---

(١) کتاب الحیوان (٤ : ٤١٦) .

(٢) «وقال شبرمة بن الطفیل و نسبها الجاحظ إلی یزید بن الطثریة » (البصریه ٢ : ٣٨٤).

(٣) الحیوان (٦ : ١٧٩)

(٤) البصریه (٢ : ١١٣)

(٥) ألاغانی (١ : ١٩١) ، والسیوطی : شرح شواهد المغنی : ١١٠ و المحاسن والأضداد : ٣٤٥ والعینی : شرح شواهد المغنی : (٣ : ٢٧٩) واللسان ماده (حشرج)

(٦) الوفیات (١ : ١٦١)

(٧) الحیوان (٦ : ١٨٢)

(٨) البصریه (٢ : ٣٩٧)

(٩) الحیوان (٦ : ٢٣٤)

(١٠) البصریه (٢ : ٣٩٥)

(١١) الحیوان (٤ : ٤٦٦)

کے بعد الورل الطائی کا قطعہ ہے، یہاں بھی اسی ترتیب سے ہے اور وہی روایت ہے اور وہی قائل ہے[1].

ثعلب (۲۰۰-۲۹۱ ھ) کی تصانیف میں سے بھی کوئی کتاب اس کے پیش نظر ضرور تھی لیکن راقم یہ پتا چلانے سے قاصر رہا کہ وہ کتاب کیا ہے؟ قعنب بن أمّ صاحب کا قطعہ «و إن ضننوا»[2] جو حماسۂ ابو تمام اور دوسری مشہور کتابوں میں مندرج ہے[3]. اس کے متعلق ہمارے مصنف نے اضافہ کیا ہے کہ ثعلب نے اسے طیسلة الفزاری کی طرف منسوب کیا ہے[4].

ان کتابوں کے علاوہ قراین مؤید ہیں کہ مندرجہ ذیل کتابیں بھی حماسۂ بصریہ کے ماخذوں میں ہیں:

مجموعة المعانی:

ضابیء بن الحارث[5] البرجمی کے قطعۂ بائیہ کے دو شعر «یخیب» اور «وجیب» حماسۂ بصریہ میں اسی طرح درج ہیں جس طرح «مجموعة المعانی» میں، حالانکہ «حماسۂ بصریہ» اور «مجموعة المعانی» کی قراءت میں اور دوسرے مصادر کی قراءتوں میں کافی اختلافات ہیں. بحتری کا ایک قطعہ[6] «شمائل ابنی مخلدِ» کی روایت ٹھیک اسی طرح ہے جس طرح «مجموعة المعانی» میں حالانکہ دیوان کی روایت میں اختلاف ہے. جابر بن رألان الطائی کا قطعہ «مأرب» بھی «مجموعة المعانی» سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے دونوں کے عنوانات بھی ایک ہیں[7].

---

(۱) البصرية (۲ : ۳۹۶)، الحیوان (٤ : ٤٦٨)

(۲) البصرية (۲ : ۷٦)

(۳) ابو تمام: الحماسة (٤ : ۱۲)، ابن الشجری: المختارات : ۹، سیوطی شرح شواهد المغنی : ۳۲٦

(٤) «و نسبها ثعلب إلى طیسلة الفزاری» (البصرية ۲ : ۷٦)

(٥) البصریه (۲ : ٥٦)، مجموعة المعانی : ۱٥۳

(٦) البصرية (۱ : ۱۷٥)، مجموعة المعانی: ۱٦۸، دیوان البحتری: ۱۷۲ (مصر ۱۹۱۱ء).

(۷) البصرية (۲ : ۳٥۲) «قال جابر فی صفة ماء» «مجموعه» میں عنوان ہے «ما قیل فی المیاه» اس کے بعد سب سے پہلا قطعہ یہی درج کیا ہے.

حماسۂ بحتری :

باب الملح و المجون کے تین قطعات رقم : ۳۹ ، ۴۱ ، ۴۵ باب الإنابة والزهد کا قطعہ رقم : ۱۹ یہ سارے قطعات حماسۂ بحتری ہی سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں ۔ ایک قطعہ جو «الحماسة البصرية» نسخۂ راغب میں نہیں[۱] بحتری ہی سے ماخوذ ہے ، قطعہ کی روایت بھی وہی ہے جو بحتری کے یہاں ہے۔ اسی طرح کچھ اور قطعات کے متعلق قیاس ہے کہ وہ حماسۂ بحتری سے ماخوذ ہیں۔ بعض گم نام شاعروں کے اشعار کا سرچشمہ بھی یہی حماسۂ بحتری ہو تو عجب نہیں

حماسۂ ابن الشجری :

الحماسة البصرية کے ماخذوں میں حماسۂ ابن الشجری بھی معلوم ہوتا ہے۔ ابن ھرمہ کا قطعہ « الذابل»[۲] اور یزید بن حکم الثقفی کا عینیہ « واقع»[۳] دونوں ابن الشجری کے حماسے سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں ۔

زهر الآداب للحصری :

کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حصری کی « زهر الآداب » بھی مصنف کے مأخذوں میں ہے۔ « استطراد » کے ذکر میں الحصری نے بکر بن النطاح کے جس قطعۂ بائیہ « بکوکبِ » کو پیش کیا ہے وہی « بصریہ » میں موجود ہے ۔ ہمارے یہاں عنوان ہے ۔ « وجاءت باستطراد فیه هجاء و مدح[۴] ».

الإقتضاب فی شرح أدب الکتّاب :

یہ کتاب بھی بصریہ کے ماخذوں میں معلوم ہوتی ہے ۔ ایک قطعہ « العویل » غالباً اسی کتاب سے ماخوذ ہے[۵] ۔ روایت بھی لفظ بہ لفظ وہی ہے ۔ سیرت کی کتابوں میں یہ قطعہ عبداللہ بن رواحہؓ کے نام ہے ، قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ قطعہ نہ تو حسان بن ثابتؓ کے دیوان میں ہے اور

---

(۱) حماسۂ بصریہ نسخۂ عاشر آفندی : ۴۱۳ ، حماسۂ بحتری : ۲۶۸
(۱) البصریہ (۱ : ۱۶۱) ، ابن الشجری : ۱۰۵
(۳) البصریہ (۲ : ۱۷) ، ابن الشجری ۱۳۹
(۴) البصریہ (۱ : ۱۶۳) ، الحصری : زهرالآداب (۴ : ۱۵۲)
(۵) البصریہ (۱ : ۲۰۱) و الإقتضاب : ۳۶۹

نہ کسی ماخذ میں ہماری نظر سے گذرا ۔ «الإقتضاب» ہی ایسی کتاب ہے جس میں بلا اختلاف حسان کے نام درج ہونا اس بات کا یقین دلاتا ہے کہ بصریہ کے مصنف نے وہیں سے اخذ کیا ہے ۔ اسی طرح ایک قطعہ «لتقدمی» ہمیں کسی کتاب میں نہ مل سکا یہ «الإقتضاب» میں موجود ہے[1]، روایت بالکل وہی ہے، وہاں بھی قائل مجہول ہے یہاں بھی قائل کا نام درج نہیں ۔

اسی طرح بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ابو ہلال العسکری کی «کتاب المعانی» بھی «البصریۃ» کے ماخذوں میں ہے ۔

بصریہ کے اوہام و اسقام :

حماسۂ بصریہ کی ترتیب و تہذیب پر مصنف ایک عرصہ تک کام کرتا رہا ہے، خیال تھا کہ کم از کم آخری روایت، اغلاط و اوہام سے بہت حد تک پاک ہوگی ۔ مصنف نے کتاب کی ابتدا میں لکھا ہے کہ خالدیین نے اکثر اشعار غیر قائلین کی طرف منسوب کردیے ہیں اور یوں نسبتیں غلط ہوگئی ہیں، اصل کتاب میں بھی ایک جگہ ان پر اعتراض کیا ہے : «و رواها الخالدیان لمالک بن نویرة و لیست له»[2] اور لطف یہ ہے کہ نسخۂ عاشر میں بھی قطعہ مالک بن نویرة کی طرف اس نے خود منسوب کیا ہے ۔ خالدیین نے ممکن ہے بعض قطعات غیر قائلین کی طرف منسوب کیے ہوں لیکن کم از کم ہمارے مصنف کو اس پر اعتراض کا حق نہیں بیسیوں مقامات پر خود غیر قائلین کی طرف اشعار منسوب کیے ہیں ۔ اور بھی متعدد قسم کی بے قاعدگیاں اس کتاب میں ملتی ہیں ۔

ایک ہی قطعہ دو شاعروں کی طرف منسوب کیا ہے، ایک شاعر کے قطعے میں دوسرے شاعر کے اشعار داخل کردیے ہیں، باپ کا شعر بیٹے کی طرف منسوب کیا ہے ۔ شعراء کے نام غلط لکھے ہیں انہیں غلط قبیلوں کی طرف منسوب کیا ہے ۔ شعراء کے زمانۂ حیات کے متعلق اس کا تصور واضح نہیں ۔

---

(١) البصریہ (١ : ٧٣) و الإقتضاب : ٣٦٩

(٢) البصریہ (١ : ٢٤٩) ۔

ہمارا مصنف اسلامی عہد کے شعراء کو مخضرم لکھتا ہے اور مخضرم کو اسلامی عہد کا شاعر تصور کرتا ہے. جاہلی شاعر کو وہ اسلامی لکھتا ہے اور اسلامی عہد کے شاعر کو عہدِ جاہلیت کے شعراء میں شمار کرتا ہے. اس قسم کے اوہام کی مثالیں کتاب میں جا بجا بکھری ہوئی ملیں گی. یہاں استقصا مقصود نہیں صرف چند مثالیں درج کی جاتی ہیں.

«حماسۃ بصریہ» کا قطعہ، «تسبقُ»[1] اور «سملق»[2] مصنف نے أعشیٰ ہمدان کی طرف منسوب کیا ہے یہ قطعے أعشیٰ میمون کے ہیں. طرفہ کا قطعہ «ذلیلُ»[3] جو اس کے دیوان اور «حماسۃ ابو تمام» میں موجود ہے مصنف نے نسخۂ راغب میں جو اس کی کتاب کی روایت دوم ہے اپنے خیال میں صحیح کرکے ہیثم بن الأسود النخعی کی طرف منسوب کیا ہے. صحیح وہی ہے جو نسخۂ عاشر میں اس نے درج کیا تھا. عربی شاعری کا مشہور قطعۂ نسائیہ جو زینب بنت یوسف اختِ حجاج کی تشبیب میں ہے اسے عبداللہ بن نمیر کی طرف منسوب کیا ہے[4]. صحیح یہ ہے کہ یہ قطعہ اس کے بیٹے محمد بن عبداللہ النمیری کے نتائج فکر میں سے ہے. اس طرح ایک قطعہ «لازمُ» عبد الأعلیٰ القرشی کی طرف منسوب کیا ہے[5]. واقعہ یہ ہے کہ یہ قطعہ اس کے بیٹے عبد اللہ بن عبد الأعلیٰ کی ملکیت ہے. أعشیٰ میمون کا قطعہ «الناظرِ» مصنف کے خیال میں زہیر بن أبی سُلمیٰ کا ہے[6] یہ قطعہ «دیوان اعشیٰ» کے علاوہ شواہد مغنی کی تمام شرحوں میں یہاں تک کہ «کتاب سیبویہ» میں بھی موجود ہے اور ان سارے مصادر میں اس کی نسبت أعشیٰ کی طرف ہے. نسخۂ عاشر میں ابراہیم الصولی کا قطعہ «الناظرُ» اس کے دیوان میں اور مختلف مصادر میں اس کے نام درج ہے، ہمارا مصنف اس کا قائل فتح بن خاقان کو بتاتا ہے[7]. ایک قطعہ «مقنعُ» ابو تمام نے عقبۃ بن بجیر اور تبریزی نے مسکین الدارمی کی

(۱) البصریۃ ۱ : ۳۳ (۲) البصریۃ ۱ : ۱۷۵ (۳) البصریۃ ۱ : ۷۳
(٤) ایضاً ۲ : ۳۰۵ (٥) ایضاً ۲ : ٤۲۷ (٦) ایضاً ۱ : ۱٦۷
(۷) ایضاً ۱ : ۲٦۷

طرف منسوب کیا ہے ۔ ابو تمام کا حماسہ «بصریہ» کے اہم مأخذوں میں ہے ۔ پھر بھی وہ ان دونوں نسبتوں سے اعراض کرکے عقبة بن مسکین الدارمی کو اس قطعے کا مصنف بتاتا ہے[1] ۔ یہ قطعہ طفیل الغنوی، کعب بن سعد الغنوی، اور عروة بن الورد کی طرف بھی منسوب ہے لیکن عقبة بن مسکین الدارمی کی طرف نسبت کسی اور مصدر میں راقم کی نظر سے نہیں گذری ۔

قبیلوں کی طرف غلط نسبتوں کی مثالیں بھی ملتی ہیں مثلاً اس نے الحارث بن عباد کو عبسی لکھا ہے[2] در حقیقت وہ بکری ہے، أعشی میمون کو باہلی لکھا ہے[3] اعشیٰ باہلہ دوسرا شاعر ہے جس کا نام عامر بن الحارث ہے اور کنیت ابو قحافہ ۔

ہمارا مصنف شعراء کے نام تک غلط لکھتا ہے ۔ المتوکل اللیثی کا نام عبداللہ بن نہشل بتایا ہے[4] حالانکہ عبداللہ اس کے باپ کا نام ہے ۔ ابوالخطار کا نام بشر بن صفوان الکلابی لکھا ہے[5] ۔ اس کا نام حسام بن ضرار الکلبی ہے ۔ أحوص الیربوعی کو زید کا بیٹا بتاتا ہے[6]۔ حقیقت یہ ہے زید خود اس کا نام ہے باپ کا نام عمرو ہے ۔ أمیة بن أبی الصلت کے بیٹے کا نام ابوالقاسم لکھا ہے[7] ۔ اس کا نام قاسم بن امیة ہے ۔ ابوالعباس الأعمیٰ کا نام المسیب بن فروخ نہیں جیسا کہ مصنف نے لکھا ہے[8] بلکہ السائب بن فروخ ہے ۔ مروان بن ابی حفصہ کا نام زید نہیں[9]، یزید ہے ۔ ابوالطمحان القینی کا نام شرقی بن حنظلہ[10] نہیں حنظلة بن الشرقی ہے ۔ أعشیٰ بنی ربیعة کا نام عبداللہ بن خارجہ ہے، عبداللہ بن المخارق نہیں جیسا کہ مؤلف نے لکھا ہے[11]۔ ایک قطعہ «لا یموت» کا مصنف عجلان النہدی کو بتایا ہے[12] ۔ اس کا صحیح نام عبداللہ بن العجلان النہدی ہے ۔ ابوحکیمہ راشد بن اسحاق کا نام

(۱) البصریة ۲ : ۲۴۷ (۲) البصریة ۱ : ۱۶ (۳) البصریة ۱ : ۸۵
(۴) ایضاً ۲ : ۱۵ (۵) ایضاً ۱ : ۸۱ (۶) ایضاً ۱ : ۲۹ ۱
(۷) ایضاً ۱ : ۱۳۴ (۸) ایضاً ۱ : ۱۳۷ (۹) ایضاً ۱ : ۱۴۲
(۱۰) ایضاً ۱ : ۱۶۱ (۱۱) ایضاً ۲ : ۹ (۱۲) ایضاً ۲ : ۱۱۵

أبو حکیمه بن راشد لکھا ہے[١]. ایک مقام پر ابو حکیمه کو أبو حلیمه بھی لکھا ہے[٢]. العوام بن کعب بن زهیر کا نام ابو العوام بن کعب لکھا ہے[٣].

طریف العبسی کے قطعۂ رائیه کے متعلق لکھا ہے که شاعر نے اپنے باپ کے مرثیے میں لکھا ہے[٤]. اس قطعے کے چوتھے شعر:

وکنت به أکنی فأصبحت کلما کنیت به فاضت دموعی علی نحری

سے یه بات قطعی ہو جاتی ہے که یه اشعار باپ کے مرثیے کے نہیں بلکه بیٹے کے مرثیے کے ہیں.

شعراء کے عہد کے متعلق ہمارے مصنف کا تصور کس قدر غیر واضح ہے اس کا اندازہ ذیل کی مثالوں سے ہوگا:

وہ قیس بن الخطیم کو جو مخضرم ہے کبھی جاہلی سمجھتا ہے[٥] اور کبھی اموی[٦] لکھتا ہے، اسی طرح اس نے کمیت بن معروف کو اموی لکھا ہے[٧]. کون نہیں جانتا که وہ مخضرم ہے. عہد سرورِ کائنات صلی اللہ علیه وسلم میں وہ اسلام لائے لیکن ملاقات نه ہوسکی. مضرس بن ربعی کو جاہلی بتایا ہے[٨]، کتب تواریخ میں فرزدق سے اس کی ملاقات کا حال لکھا ہے یه اگر صحیح ہے تو وہ جاہلی کیوں کر ہوسکتا ہے. القتال الکلابی کو اس نے جاہلی لکھا ہے[٩] مرزوقی نے اسے اسلامی بتایا ہے. وہ اموی عہد کا شاعر ہے. هیثم بن الأسود کو جاہلی لکھا ہے[١٠]، یه عہد امیه کا شاعر ہے ابن حجر کی «الإصابة» اور «تہذیب التہذیب» دیکھی جائے. ابو کبیر الہذلی کو جاہلی لکھا ہے[١١]، یه حقیقت میں مخضرم ہیں اور بعضوں نے انہیں صحابی لکھا ہے. ربیعة بن مقروم الضبی کو ایک نسخے میں جاہلی لکھا ہے[١٢] یه مخضرم

---

(١) البصرية ٢ : ١٨٢ (٢) البصرية ٢ : ١٧٩ (٣) البصرية ٢ : ١٩١
(٤) ایضاً ١: ٢٤٠ (٥) ایضاً ١ : ١٢ (٦) ایضاً ٢ : ٨٥
(٧) ایضاً ٢ : ٨٩، ١٠٥ (٨) ایضاً ١ : ٣٠
(٩) ایضاً ١ : ٣٤ (١٠) ایضاً ١ : ٤٣ (١١) ایضاً ١ : ٥٨
(١٢) ایضاً ١ : ٤٦

ہے «الإصابہ» اور «معجم الشعراء» للمرزبانی ملاحظہ ہو. سُلمیٰ بن ربیعة کو نسخۂ نور عثمانیہ میں مخضرم لکھا ہے[1]، «سمط اللآلی» اور دوسرے مصادر میں تصریح ہے کہ وہ جاہلی شاعر ہے. اسی طرح شماخ کو اسلامی لکھا ہے[2] یہ مخضرم ہے لطف یہ ہے کہ ایک مقام پر مصنف اسے مخضرم لکھ آیا ہے[3].

«الحماسة البصرية» کے قلمی نسخے:

اس وقت مشرق و مغرب کے کتاب خانوں میں «حماسۂ بصریہ» کے متعدد مکمل اور ناقص نسخے پائے جاتے ہیں لیکن أمہات نسخ کی تعداد دو تین سے زاید نہیں، بقیہ نسخے انہی نسخوں کی نقلیں ہیں یا بہت بعد کے لکھے ہوئے ہیں اور اغلاط سے بھرے ہوئے. ذیل میں معلوم شدہ نسخوں کی مختصر کیفیت لکھی جاتی ہے:

۱ - نسخۂ کتاب خانۂ عاشر آفندی استانبول رقم: ۷۸٦

اوراق: ۲٤۳ سطور ۱۵ یہ «بصریہ» کی وہ مختصر روایت ہے جو مصنف نے ابتدا میں ٦٤۷ ھ میں مرتب کی تھی اور سلطان ابوالمظفر یوسف بن الملک العزیز[4] کی خدمت میں پیش کی تھی. اس نسخے کے آخر میں الملک الناصر داؤد بن عیسیٰ بن أبی بکر بن ایوب[5]، ابن العدیم[6]، کمال الدین بن طلحة[7]، وزیر مؤید الدین ابراهیم ابن القفطی[8]، شهاب الدین یحیٰ بن

(۱) البصرية ۱ : ٥٦ (۲) البصرية ۱ : ۱۲۱

(۳) ایضاً ۱ : ۱۲۹ (٤) (٦۲۷ - ٦٥۹هـ) رک (بہ رجوع کنید)

(٥) (٦۰۳ - ٦٥٦هـ) رک وفيات الأعيان (۱ : ۱٥٦)، فوات الوفيات (۱ : ۲۹۷)

(٦) (٥۸٦ - ٦٦۰هـ) رک فوات الوفيات (۲ : ۱۰۱)، شذرات الذهب (٥ : ۳۰۳)

(۷) (٥۸۲ - ٦٥۲هـ) رک السبكي: طبقات الشافعية (٥ : ۲٦)، شذرات الذهب (٥ : ۲٥۹)

(۸) (٥۹٤ - ٦٥۸هـ) رک الأدفوی: الطالع السعيد: ۳۳

القیسرانی[1] ، نظام الدین محمد بن المولوی المنشی[2] ، فتح الدین اسحاق بن یعیش[3] ، مجد الدین ابو عبداللہ محمد بن أحمد الاربلی معروف بابن الظهیر[4] ، ابن مالک

---

(۱) ابن القیسرانی اور ابن الظهیر الاربلی کے متعلق Prof. Sir Hamilton Gibb ایک خط میں اطلاع دیتے ہیں :

> "The only two persons whom I can identify in your lists are : Shihab ad-Din Yahya ibn al Qaisarani, *for whom see al-Durar al-Kamina of* Ibn Hajar, Vol. ix, No. 1142; and Majd ad-Din (Abu 'Abdullah Muhammad b. Ahmad) al Arbili, Called Ibn Zuhair (d. 677/1278), who is mentioned in *Les Biographies du Manhal Safi* (cf Ibn Taghribardi index prepared G. G. wiet (Cairo 1932) no. 2024"

ابن الظهیر الاربلی کا ترجمہ تو بعد کو مجھے اور مصادر میں بھی مل گیا لیکن استاذ مکرم پروفیسر گب نے جن ابن القیسرانی کے متعلق ابن ابن حجر کی « الدرر الکامنہ » کا حوالہ دیا ہے . وہ ہمارے مصنف کے تقریظ نگار ابن القیسرانی سے مختلف ہیں اس لیے کہ ان کا ابن حجر کی کتاب میں مندرج ہونا ہی ثبوت اس بات کا ہے کہ وہ آٹھویں صدی ہجری کے عالم ہیں . ان کی ولادت ابن حجر کے قول کے مطابق سنہ ۷۰۰ھ میں ہوئی ہے جبکہ ہمارا مصنف صدرالدین ۶۵۹ھ میں فوت ہوچکا ہے . شہاب الدین یحییٰ بن القیسرانی معاصر صدر الدین ساتویں صدی ہجری کا عالم ہے جسکی وفات چھٹی صدی ہجری کے اواخر اور ساتویں صدی ہجری کے عشرۂ پنجم یا ششم میں ہونی چاہیے . جو تاریخی اور ادبی مصادر راقم کی نظر سے گزرے ہیں وہ ان کے متعلق خاموش ہیں . یونینی کی «ذیل مرآۃالزمان» میں یوسف بن محمد بن غازی کے ذکر میں استطراداً ان کا ذکر آگیا ہے اور سنہ ۶۰۳ھ میں فتح شیزر کے موقع پر ان کے شعر پڑھنے کا ذکر ہے وہاں ان کا نام شہاب‌الدین یحییٰ بن خالد بن القیسرانی درج ہے (رک الحماسة البصرية ۲ : خاتمہ : ۱۰ فٹ‌نوٹ (۱)

(۲) (۵۹۵ ـ ۶۵۶ھ) رک الصفدی : الوافی بالوفیات (۱ : ۲۸۳) طبع ۱۹۶۲م

(۳) (۶۰۱ ـ ۶۵۹ھ) رک الیونینی : ذیل مرآۃ الزمان (۲ : ۱۲۶)

(٤) (۶۰۲ ـ ۶۷۷ھ) رک الکتبی : الفوات (۲ : ۱۷۵) ، الصفدی : الوافی ۲ : ۱۲۳، ابن‌العماد : شذرات (۵ : ۳۵۹)

النحوی[1] ، ابن عمرون[2] ، فخر الدین حسین النحوی ، اور عون الدین سلیمان بن عبدالمجید بن العجمی وغیرهم کی تقریظوں کی نقلیں ھیں۔ سال کتابت درج نہیں ھے لیکن نسخه قدیم اور اھم ھے ۔ اس کا ذکر *MFO* جلد ٥ ص ٥٣٨ کے ایک مضمون میں ھوا ھے۔

۲۔ نسخهٔ کتب خانهٔ عبدالله باشا الفکری[3] :

صفحات ۲۸۱ سطور ۲٦ مکتوبه ۱۲۸٦ھ خط مغربی مکتوبه یحییٰ بن محمد بن لوئیس القاصی الزواوی الجزائری ، خاتمهٔ کتاب میں کاتب نے لکھا ھے که یه نسخه ایک قدیم مخطوطے سے منقول ھے جس کے آخر میں کچھ علماء کی تقریظات درج ھیں۔ مقابله کرنے سے معلوم ھوا که پیش نظر نسخه ، نسخهٔ عاشرآفندی رقم: ۷۸۷ کی نقل ھے ۔ اس کی کتابت سلطان عبدالعزیز خاں کے عہد میں استانبول میں کی گئی ھے ۔ یه نسخه عبدالله باشا فکری کی ملکیت میں رہ چکا ھے اب استاد گرامی پروفیسر عبدالعزیز المیمنی کے کتب خانے میں محفوظ ھے ۔ سرورق پر ان کے قلم سے یه عبارت لکھی ھوئی ھے: «هذه النسخة لعبد الله باشا الفکری واشتریتها من ابنه۔ المیمنی»۔

۳۔ نسخهٔ کتب خانهٔ نور عثمانیه ، استانبول رقم : ۳۸۰٤

مکتوبه ٦٥۱ ھ اوراق ۳۱۳ سطور ۱۳ بعض صفحوں میں ۱٥ سطریں خط نسخی ۔ اکثر الفاظ پر حرکات ضبط کردیے گئے ھیں، حواشی پر کہیں کہیں تصحیحات و تعلیقات بھی درج ھیں ۔ نسخه مصنف کی زندگی میں نقل کیا گیا ھے اور اب تک کے معلوم شده نسخوں میں سب سے قدیم ھے ۔ سرورق پر ایک وقف نامے کی عبارت بقلم ابراھیم حنیف مفتش اوقاف حرمین شرفین درج ھے جو سلطان ترکی ، عثمان خان بن سلطان

---

(۱) (٦۰۰ ـ ٦۷۲ھ) رک الکتبی : الفوات (۲ : ۲۲۷)، السبکی : طبقات الشافعية (٥ : ۲۸)؛ الصفدی : الوافی (۳ : ۳٥۹)

(۲) (٥۹٦-٦٤۹ھ) رک السیوطی: بغية الوعاة : ۹۹، الصفدی : الوافی (۱ : ۱۹۷)

(۳) " کی کتاب *GAL* ۔ اس نسخے کے ذکر سے خالی ھے۔

مصطفےٰ خاں کے کتب خانے کی اکثر کتابوں پر دیکھنے میں آتی ہے۔ ایک مہر بھی موجود ہے جس میں «بندۂ لطیف ابراھیم حنیف» منقوش ہے۔ کاتب کا نام درج نہیں ترجمہ کی عبارت حسب ذیل ہے:

«آخر الکتاب والحمد لله رب العالمین وصلی الله علی سیدنا محمد النبیؐ وآله الطاهرین وسلم تسلیماً کثیرا. وقع الفراغ منه یوم الأحد، العاشر من ربیع الآخر سنة إحدی و خمسین وستّ مائة».

٤ - نسخۂ کتب خانہ راغب پاشا، استانبول. رقم: ۱۰۹۱

اوراق ۵۱۰ سطور ۱۵ یہ نسخہ نہایت خوش خط اور صحیح ہے اور ہر لحاظ سے جلیل القدر ہے۔ «نصریه» کے ان دو معلوم شدہ نسخوں میں یہ نسخہ ایک ہے، جو مصنف کی زندگی میں نقل کیا گیا ہے۔ جرمن رسالے *ZDMG* جلد ٦٤ ص ۲۱۱ میں اس پر ایک مضمون شائع ہوا ہے۔

۵ - نسخۂ کتب خانۂ سلمانیه، استانبول. رقم: ۷۸۷ [1]

اوراق ۲۵۲. سال کتابت درج نہیں، نسخہ ساتویں صدی ہجری کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کتابت خوبصورت نسخ میں ہے، کاتب کا نام سلیمان بن العجمی ہے۔ یہ نسخہ پہلے مکتبۂ رئیس الکتاب میں تھا، اب جامع سلیمانیه کے کتب خانے میں کئی کتب خانے لاکر جمع کردیے گئے ہیں چنانچہ رئیس الکتاب کا کتب خانہ بھی وہیں آگیا ہے اور یہ نسخہ وہیں محفوظ ہے۔

٦ - نسخۂ کتب خانہ عاطف آفندی استانبول رقم: ۲۰۵۳ سال کتابت ۹۸۳ھ اوراق ۳۰۰ سطور ۲۵ تفصیل کے لیے دیکھا جائے *MFO* جلد ۵ ص ٤۸۹۔

۷ - نسخۂ کتب خانۂ بلدیه اسکندریه رقم: ۱۲۲۱ [2] اوراق ۸٤ سطور

---

(۱) Brockelmann نے اس نسخے کا ذکر نہیں کیا ہے۔

(۲) Brokelmann کی تاریخ ادبیات میں اس نسخہ کا کوئی ذکر نہیں، اس کی تفصیلات اور ابتدائی کچھ صفحوں کے عکس جناب مالک رام صاحب ایم۔ اے نے جو اس وقت مصر میں حکومت ہند کی وزارت خارجہ سے متعلق تھے اور اسکندریه میں مقیم تھے راقم کے پاس بھیجے تھے میں اس عنایت کے لیے ان کا ممنون ہوں۔

۲۱ ناقص الآخر کتابت بارھویں صدی ھجری کی معلوم ھوتی ھے لیکن کتابت احتیاط سے کی گئی ھے اور غالباً کوئی قدیم اور صحیح نسخه اس کا منقول عنه رھا ھے. خط بہت صاف روشن ھے، شعرا کے نام سرخ روشنائی سے لکھے گئے ھیں اور متن سیاہ ھے، اسی قلم سے جا بجا حاشیه پر تشریحات اور معانی لکھے گئے ھیں. بعض صفحات پر کسی اور کے قلم کے حواشی بھی ملتے ھیں اور یه بہت بعد کے لکھے ھوئے ھیں بالعموم ان کی نوعیت معانی یا تشریح کی نہیں بلکه مؤلف نے جو اشعار متن میں دیے ھیں اگر ان کے درمیان سے کوئی شعر چھوٹ گیا ھے تو حاشیه نگار لکھتا ھے «بیت ساقط» یا «تروی أبیات ثلاث فی أولها» اور پھر وہ حاشیه نگار شعر نقل کردیتا ھے ایسا معلوم ھوتا ھے که کسی خوش ذوق کے پاس یه نسخه رھا ھے اور یه اندراجات و اضافات سب اسی کے قلم کے ھیں.

۸ ـ نسخۂ کتب خانۂ اسکوریال، اسپین رقم: ۲۸۰٤ یه دو جلدوں میں ھے، دیوان ابن أبی ربیعة (لبسک ۱۹۰۲) کے مرتب اس کا حواله دیتا ھے فہرست کتب خانۂ اسکوریال ص ۲۱۳ کے علاوہ Brockelmann کی *GAL* میں بھی اس کا ذکر موجود ھے.

۹ ـ نسخۂ کتب خانه میلان، اطالیه[1]:

رؤلف گائر نے «دیوان الأعشی» کے حواشی اور اختلاف روایت کے لیے اس نسخے کو استعمال کیا ھے.

۱۰ ـ نسخۂ کتب خانۂ حسین چلپی بروصه، ترکی[2]:

اس نسخه کا ذکر *ZOMG* جلد ٦٨ کے ایک مضمون میں ملتا ھے.

۱۱ ـ نسخۂ دارالکتب المصریه قاھرہ رقم: ادب: ۵۲۰[3]:

---

(۱) Brockelmann کو اس نسخے کے وجود کا علم نہیں.

(۲) Brockelmann کی کتاب میں اس نسخے کے متعلق کوئی اطلاع موجود نہیں.

(۳) دارالکتب میں نسخۂ راغب استانبول کی عکسی نقل بھی محفوظ ھے. مصور: ٦٣۰۰

سال کتابت ۱۲۸۷ ھ، یہ نسخہ مخطوطۂ راغب پاشا استانبول مکتوبہ ٦٥٤ ھ سےعبدالرحمن بن عبداللہ البغدادی نے اوائل شہر رجب ۱۲۸۷ ھ میں نقل کیا ہے ۔

۱۲ ۔ نسخۂ دار الکتب المصریہ (تیموریہ) رقم : الشعر : ۸٦۲

تقطیع خورد صفحات ٦۸۱، یہ احمد تیمور پاشا کے کتب خانے کا نسخہ ہے جو اب دارالکتب المصریۃ میں محفوظ ہو گیا ہے۔ نسخہ معمولی ہے تعجب نہیں یہ بھی نسخۂ راغب کی نقل ہو، تفصیل *RAAD* جلد ۳ ص ۳٤۲ میں ملاحظہ ہو ۔

۱۳ ۔ نسخۂ لوئیس شیخو بیروت[1] :

یہ نسخہ بہت معمولی کاغذ پر دارالکتب المصریہ کے نسخے سے پچاس سال ہوئے نقل کرایا گیا ہے۔ ادارے کی اکثر مطبوعات میں اس نسخے کے حوالے ملتے ہیں۔

١٤ ۔ نسخۂ کتب خانہ آصفیہ، حیدرآباد[2] :

تعداد اوراق ۲۳۲ پیش نظر نسخہ «الحماسة البصریہ» کا اختصار اور انتخاب ہے ، جس کا نام سرورق پر «منتقیٰ من الحماسة البصریہ» لکھا ہوا ہے۔ اس کے بعد مصنف کا نام اور اس کے نیچے یہ عبارت تحریر ہے : ٦٤٧ تـالیف الأصل ، «الأصل مذکور فی الکشف و المنتقی لیس بمذکور فیه» کشف الظنون کا کیا ذکر، دوسرے سارے مصـادر بھی جو میری نظر سے گذرے ہیں اس انتخاب کے متعلق خاموش ہیں۔ کتابت دو کاتبوں نے مل کر کی ہے ص ۳ سے ص ٢٤ تک اور ۲۳۱ سے ۲۳۲ تک ایک کاتب کے قلم سے اور ص ۲٥ تـا ۲۳۰ کی کتـابت دوسرے کاتب نے کی ہے اور یہی اصل کاتب معلوم ہوتا ہے، اس انتخاب میں ١٦ ابواب کے بجائے صرف پانچ ابواب ہیں۔ الحماسة، المراثی، الأدب، النسیب، المدیح، نہ کاتب کا نام معلوم ہے اور نہ یہ پتـا چل سکا کہ انتخاب کرنے والا کون ہے۔

سرورق پر مالک کتاب کی یہ عبارت ہے :

«من مودعات الدهر لدی الفقیر إلی رحمة الله الصمد عبدالرحمن

---

(۱) Brockelmann نے اس نسخے کا ذکر نہیں کیا ہے۔

(۲) Brockelmann نے اس نسخے کے متعلق کوئی اطلاع نہیں دی۔

بن عبدالله بن المصطفیٰ بن محمد سنة تسع و عشرين و مائة و ألف ١١٢٩ هـ».

• • •

کتب خانۂ گوتها (مشرقی جرمنی) میں ١٧ صفحات پر مشتمل ایک مخطوطه محفوظ هے جس میں ان تمام تقریظات کو جمع کردیا هے جو نسخۂ عاشر کے آخر میں موجود هیں ان کا نام «تقریظات حماسة البصرية» رکھدیا هے. پہلی تقریظ السلطان الملک الناصر صلاح الدين أبو المظفر يوسف بن الملك الظاهر کی هے اور آخری عون الدين سليمان بن المجيد العجمی کی.
ابتدا : بسم الله الرحمن الرحيم صورة خط السلطان الملک الناصر الخ کاتب کا نام عبد الرحمن بن يحيیٰ بن محمد الملاّح هے. تاریخ کتابت ٢٠ ربيع الثانی ١٠١٦ هے رقم : ٢١٩٥ .

[١٢/٤/١٩٦٤م]

• • •

# فارسی میں علم بدیع کی تاریخ و تدوین

اشفاق علی خاں*

رشید الدین وطواط:

چھٹی صدی ہجری میں علم بدیع کا سب سے مشہور مصنف رشید الدین وطواط ہے جو فارسی کا بہت بڑا قصیدہ گو شاعر ہے۔ علم بدیع پر اس کی تصنیف کا نام «حدایق السحر فی دقایق الشعر» ہے۔ مصنف کی طرح اس کی یہ تصنیف بھی بہت مستند اور مشہور ہے۔ رشید عربی و فارسی دونوں زبانوں پر قدرت رکھتا تھا اور دونوں زبانوں میں نظم و نثر اس سے یادگار ہے۔ عربی ادب و لغت میں اسے بڑی مہارت حاصل تھی وہ زمخشری صاحب کشاف (٤٦٧ ـ ٥٣٨) کا ہمعصر تھا اور ان سے اس کی خط کتابت رہتی تھی۔ ان سے کبھی کبھی اس کے علمی مباحثے بھی ہوئے ہیں جن میں بعض مسائل پر زمخشری نے ان کی بات تسلیم کرلی تھی۔ رشید کے علم و فضل کے متعلق یاقوت «معجم الأدباء» میں لکھتا ہے کہ رشید زمانہ کے عجائبات میں سے تھا۔ وہ نظم و نثر میں اپنے زمانہ کے افاضل میں شمار ہوتا تھا اور دقایق کلام عرب اور اسرار نحو و ادب کے پہچاننے میں کسی کو اس پر برتری حاصل نہیں تھی اور اسی لیے اس کے فضائل کی شہرت ملکوں میں پھیل گئی تھی اور وہ شہرۂ آفاق ہوگیا تھا۔

«ترجمان البلاغة» کے دستیاب ہونے سے پہلے «حدایق السحر» ہی علم بدیع کی سب سے پہلی کتاب سمجھی جاتی تھی جو دستبرد زمانہ سے بچ گئی تھی۔ یہ کتاب ہندستان اور ایران میں کئی بار چھپی مگر اب عباس اقبال آشتیانی نے کتبخانۂ ملی پریس کے ایک قلمی نسخے مکتوبہ ٦٦٨ھ کی مدد سے مرتب کرکے تہران میں طبع کرادیا ہے۔

---

(*) اشفاق علی خاں (ایڈوکیٹ) شاہ جہان پور۔

اصل «حدایق السحر» کل ٨٧ صفحات پر مشتمل هے. شروع میں دو صفحوں کا دیباچه اور آخر میں تین صفحوں کی اصطلاحات هیں اس کا موضوع خالصةً علم بدیع هے. اس میں درج ذیل صنعتیں هیں جن میں کچھ لفظی هیں اور کچھ معنوی:

١ ـ الترصیع
٢ ـ الترصیع مع التجنیس
٣ ـ التجنیسات ( تام، ناقص، زاید، مرکب، مکرر، مطرّف خط)
٤ ـ الاشتقاق
٥ ـ الأسجاع (متوازی، متوازن، مطرّف)
٦ ـ المقلوبات (بعض کل، مجنح، مستوی)
٧ ـ ردالعجز علی الصدر
٨ ـ المتضاد
٩ ـ الإعنات
١٠ ـ تضمین المزدوج
١١ ـ الإستعارة
١٢ ـ حسن المطلع
١٣ ـ حسن التخلص
١٤ ـ حسن المقطع
١٥ ـ حسن الطلب
١٦ ـ مراعاة النظیر
١٧ ـ المدح الموجّه
١٨ ـ المحتمل للضدّین
١٩ ـ تاکید المدح بما یشبه الدم
٢٠ ـ الالتفات
٢١ ـ الایهام
٢٢ ـ التشبیهات ( مطلق، مشروط، کنایت اضمار، تفضیل )
٢٣ ـ سیاقة الاعداد
٢٤ ـ تنسیق الصفات
٢٥ ـ اعتراض الکلام قبل التمام یا حشو (حشو قبیح، حشو متوسط، حشو ملیح )
٢٦ ـ المتلوّن
٢٧ ـ ارسال المثل
٢٨ ـ ارسال المثلین
٢٩ ـ ذوالقافیتین
٣٠ ـ تجاهل العارف
٣١ ـ السؤال والجواب
٣٢ ـ الموشح
٣٣ ـ المربع
٣٤ ـ المسمط
٣٥ ـ الملمع
٣٦ ـ المقطع
٣٧ ـ الموصل
٣٨ ـ الحذف
٣٩ ـ الرقطاء
٤٠ ـ الخیفاء
٤١ ـ المصحف
٤٢ ـ الترجمة
٤٣ ـ المعمیٰ
٤٤ ـ اللغز
٤٥ ـ التضمین
٤٦ ـ الاغراق فی الصفة
٤٧ ـ الجمع و التفریق و التقسیم (جمع تنها، تفریق تنها، تقسیم تنها، جمع باتفریق، جمع بالقسیم، جمع با تفریق و تقسیم)
٤٨ ـ تفسیر الجلی و الخفی
٤٩ ـ المتزلزل

| | | |
|---|---|---|
| ۵۰ ـ المردّف | ۵۲ ـ الکلام الجامع | ۵۴ ـ التعجب |
| ۵۱ ـ الاستدراک[1] | ۵۳ ـ الابداع | ۵۵ ـ حسن التعلیل |

کتاب کے آخر میں علمائے بدیع کی کچھ اصطلاحات دی ہیں ان میں چار صنعتیں اور ملتی ہیں اگرچہ ان کے صنعت ہونے کی تصریح نہیں کی ہے لیکن رشید وطواط کے اصول کے مطابق یہ بھی صنعتوں میں شمار کرنے کے قابل ہیں: عکس، تدویر[2]، مکرر، اور سہل ممتنع۔

کتاب کے مطالب کی تفصیل یہ ہے: پہلے ہر صنعت کا لقب لکھا ہے پھر اس کی تعریف کی ہے بعض صنعتوں کے القاب کے لغوی معنی بھی بتائے ہیں۔ بعض صنعتوں کے کئی کئی لقب لکھے ہیں اور اگر ان میں کوئی ایسا لقب بھی ہے جو خاص فارسی والوں کا لکھا ہوا ہے تو اس خصوصیت کی تصریح کردی ہے؛ بعض صنعتوں کے طریق استعمال میں عربی اور فارسی والوں کا اختلاف بھی بیان کردیا ہے۔

ہر صنعت کے لقب اور تعریف کے بعد ایسی مثالیں نقل کی گئی ہیں جن میں وہ صنعت استعمال کی گئی ہو۔ ہر صنعت میں یہ التزام کیا گیا ہے کہ مثالیں عربی اور فارسی دونوں زبانوں سے دی جائیں۔ یہ مثالیں نثر اور نظم دونوں پر مشتمل ہیں لیکن نثر کی مثالوں کے لیے یہ التزام نہیں کیا ہے کہ وہ ہر صنعت کے ذیل میں لائی جائیں۔ بعض صنعتوں کے لیے نثر کی مثالیں نقل کی گئی ہیں بعض کے لیے نہیں۔ لیکن ان مثالوں میں عربی اور فارسی کے اشعار التزاماً ہر صنعت کے ذیل میں پیش کیے گیے ہیں۔

عربی نثر کی مثالیں فصحاء و بلغاء سے نقل کی گئی ہیں کہیں ان کے نام لیکر اور کہیں ان کے نام کے بغیر۔ بعض صنعتوں کے ذیل میں عربی

---

(۱) استدراک کوئی صنعت نہیں ہے وطواط بھی اسکے صنعت ہونے کے خلاف ہے۔

(۲) تدویر کے متعلق وطواط خود لکھتا ہے، « این بازی کودکان بود »

نثر کی مثالوں میں قرآن کریم، احادیث نبوی اور صحابہ و تابعین کے اقوال کے اقتباسات کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔

فارسی نثر کی مثالوں کے ساتھ ان کے مصنفین کے نام کہیں نہیں لیے گیے ہیں۔ جس سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض وطواط کی خود ساختہ مثالیں ہیں۔ فارسی نثر کی بعض مثالوں کے لیے لکھا گیا ہے کہ «عامہ گویند»[1]، «در سخن عامہ است»[2]، «حاکیان و وصافان عجم گویند»[3] «حاکیان گویند» ایک فارسی مثال کے متعلق لکھا ہے کہ وہ ایک روستائی کا قول ہے بوعلی سینا کے جواب میں۔ اس قول اور اس کے قایل کی بڑی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ اس نے بوعلی سینا کے مرتبے کے لایق بات کہی۔ فارسی نثر کی مثالیں نہایت چھوٹے چھوٹے جملوں یا فقروں پر مشتمل ہیں اور تعداد میں عربی نثر کی مثالوں اور خود فارسی اشعار کے مقابلے میں بہت کم ہیں مثالیہ اشعار میں سے بعض کے ساتھ ان کے شاعروں کے نام بھی لیے گیے ہیں۔ بعض اشعار شاعروں کے نام کے بغیر لائے گیے ہیں۔ جن شعراء کے نام لیے گئے ہیں وہ دو ایک کے سوا سب عربی یا فارسی کے مشاہیر میں سے ہیں ان میں چند شاعر ایسے بھی ہیں جو ذولسانیین ہیں۔ وطواط نے مثال میں اپنے عربی و فارسی شعر بھی لکھے ہیں۔

عام طور پر ہر صنعت کے ذیل میں دو تین فارسی کے شاعروں اور دو تین عربی کے شاعروں کے شعر مثال میں نقل کیے ہیں۔ ہر شاعر کے بالعموم ایک یا دو شعر درج کیے ہیں۔ صرف چند مقامات پر اس سے زیادہ شعر نقل کردیے ہیں۔ وطواط نے امثلہ و شواھد میں پورے پورے قصیدے نقل کرنے کا طریقہ اختیار نہیں کیا ہے۔ تین چار مثالیں ایک ایک مصرع کی بھی ہیں۔ صنعت جمع باتفریق اور حاجب (قبل قافیہ) کے بیان میں عربی کی کوئی مثال نہیں لائی گئی ہے۔ اشعار سے شواھد لانے میں

---

(۱) حدایق السحر: ۷۲ (۲) حدایق السحر: ٦٦ (۳) حدایق السحر: ٤٥

بالعموم اس ترتیب کا التزام کیا گیا ہے کہ ہر صنعت کے ذیل میں پہلے عربی کے اشعار نقل کیے گئے ہیں۔ ان کے بعد فارسی کے اشعار نقل کیے گئے ہیں۔ اس طرح یہ کتاب عربی اور فارسی دونوں زبانوں کے علم بدیع پر محتوی ہے البتہ کتاب کی اصل زبان فارسی ہے۔ وطواط نے دیباچہ میں بھی اس کی تصریح کردی ہے کہ اس نے یہ کتاب عربی اور فارسی دونوں کے محاسن نظم و نثر پر لکھی ہے۔

«حدایق السحر» کے دیباچہ میں رشید لکھتا ہے کہ خوارزم شاہ اتسز نے ایک دن بلاکر «ترجمان البلاغة» دکھائی تو اس نے اسے بہت غلط پایا اس لیے اس نے «حدایق السحر» لکھنی ضروری سمجھی اس کے الفاظ یہ ہیں: «ابیات شواهد آن کتاب را بس ناخوش دیدم همه از راه تکلف نظم کرده وبطریق تعسف فراهم آورده وبا این همه از انواع زلل و اصناف خلل خالی نبود واجب شد برمن بنده که پروردهٔ آن درگاهم در معرفت محاسن نظم و نثر دو زبان تازی و پارسی این کتاب ساختن واین مجموع پرداختن».

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ رشید نے «حدایق السحر» «ترجمان البلاغة» کے مقابلے پر لکھی اور ثانی الذکر کتاب دیکھ کر اسے «حدایق السحر» کی تالیف کا خیال آیا۔ اس موقع پر وہ اتسز کے لیے «نورّ الله مضجعه» کے الفاظ استعمال کرتا ہے اور اس کے زمانے کا ذکر ماضی کے صیغے سے کرتا ہے۔ اس طرح کہ «در ایام دولت او عقود فضل منتظم بود» اس کے بعد بادشاہ اسلام «خلد الله ملکه و سلطنته» اور بادشاہ اسلام «ثبت الله دولته» کے الفاظ لکھے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ «ترجمان البلاغة» جسے دیکھ کر رشید نے «حدایق السحر» لکھنے کا ارادہ کیا اتسز نے ہی رشید کو دکھائی تھی لیکن اس کی تالیف اتسز کے زمانے میں نہ ہوسکی بلکہ اس کی وفات کے بعد ہوئی۔ لہذا اس کا زمانۂ تالیف اتسز کے بیٹے ایل ارسلان(۵۵۱ ـ ۵۶۸ھ) کا دور حکومت سمجھنا چاہیے یا ایل ارسلان کے بیٹے سلطان تکش کا

زمانہ سمجھنا چاہیے یعنی سلطان تکش کے سال جلوس (۵٦۸ ھ) اور رشید کی وفات (۵۷۳ ھ - ۵۷۸ ھ) کی درمیانی مدت۔

رشید نے «حدایق السحر» کے مآخذ و مصادر نہیں بتائے ہیں لیکن ان کی کتاب کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کی تالیف کے وقت «ترجمان البلاغة» کے علاوہ اس فن کی متعدد کتابیں رشید کے پیش نظر تھیں اور ان میں عربی کے ساتھ کچھ فارسی کی کتابیں تھیں جو امتداد زمانہ سے ضائع ہوگئیں اور ہم تک نہیں پہنچیں۔

«حدایق السحر» کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب میں جواقوال رشید وطواط نے بلغاء، شعرائے پارسی، خلیل، بعضی از اهل این علم (بدیع)، ارباب صناعت، عجم، اهل صناعت، ارباب بیان اور قدماء سے نقل کیے ہیں، ایک قول «مردمان» سے بھی نقل کیا ہے۔ باقی اقوال کے لیے صرف «خوانند» لکھا ہے مثلاً «این صنعت را تخییل نیز خوانند»، اس «خوانند» کا فاعل ظاهر ہے کہ عوام نہیں ہوسکتے بلکہ «علمائے بدیع» ہیں اس طرح ان اقوال کے مآخذ علمائے بلاغت و بدیع ہیں جن میں عربی اور فارسی دونوں کے اهل نظم و نثر شامل ہیں۔ عربی کی مثال میں متنبی کے تین شعر اور فارسی کی مثال میں ایک ایک شعر رودکی اور منطقی کا اور دو دو شعر عنصری اور معزی کے نقل کیے ہیں اب یہ غور طلب ہے کہ یہ اقوال رشید نے ادبی مجلسوں اور علمی تذکروں میں علمائے فن کی زبان سے سنے یا کتابوں میں پڑھے۔ ان اقتباسات کے مطالعہ سے مجموعی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ممکن ہے ان اقوال میں چند زبانی سنے ہوئے بھی شامل ہوں، لیکن ان میں کے زیادہ اقوال رشید نے کتابوں میں پڑھے ہیں اور ان سے اپنی کتاب میں نقل کیے۔ رشید جیسے عالم سے یہ بات بہت بعید معلوم ہوتی ہے کہ وہ ایسی اہم تالیف میں جو موضوع کے لحاظ سے بھی اہم ہے، اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ ایک کتاب کے مقابلہ میں لکھی جارہی ہے اور اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ ایک بادشاہ کے لیے لکھی جارہی ہے، محض سنی سنائی باتیں لکھے گا۔ دو چار باتیں جو بعض صنعتوں کے متعلق اس وقت اهل علم میں بہت زیادہ

مشہور ہوگئی ہوں اور کتابوں میں نہ آ پائی ہوں صرف خواص کی زبان پر ہوں اس کتاب میں ان کے نقل ہونے کا مضایقہ نہیں۔

« حدایق السحر» کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تالیف میں رشید نے متعدد فنی کتابوں سے مدد لی ہے۔ « شعرائے پارسی»[1] اور «عجم»[2] کے الفاظ سے اور ایک عبارت[3] سے یہ بھی ثابت ہے کہ ان کتابوں میں کئی کتابیں فارسی کی تھیں جو ہم تک نہیں پہنچیں۔ ردیف کو رشید خالص فارسی شعرا کی صنعت کہتا ہے اس کے متعلق اس نے تین قول نقل کیے ہیں[4]۔ ایک یہ کہ «این شعر را اہل صناعت مردف خوانند» دوسرا یہ کہ « این کلمہ ردیف را بعضی از اہل صناعت حاجب خوانند» تیسرا یہ کہ « و بعضی گفتہ اند کہ حاجب آن کلمہ باشد کی او را پیش از قافیت بیارند» یہ اقوال فارسی صنعت کے متعلق ہونے کے سبب سے فارسی مصنفین ہی کے ہوسکتے ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ملحوظ رکھیے کہ « الابداع» کی نسبت رشید لکھتا ہے کہ « مثالی از آنچ قدما در کتب خویش آوردہ اند آوردم»[5] اور یہ لکھ کر مثال میں قدما کی کتابوں سے عربی کے ساتھ فارسی کے شعر بھی نقل کرتا ہے۔ یہاں اس نے توضیح کردی ہے کہ اس کے مآخذ میں قدماء کی عربی فارسی کتب فن ہیں۔ ان شواہد سے یہ بات یقین کی حد تک پہنچ جاتی ہے کہ عربی کے علاوہ فارسی کے قدیم مصنفین بدیع کی بھی متعدد کتابیں اس کے پیش نظر تھیں اور ان سے اس نے نقل و اقتباس کیا ہے۔ ان شواہد سے یہ شبہہ بھی بالکل رفع ہوجاتا ہے کہ اقوال جو کثیر تعداد میں ہیں رشید نے کسی ایک ہی عربی یا فارسی کی کتاب سے نقل کیے ہوں۔

کتب فن کے علاوہ رشید نے دواوین شعرا اور نظم کی دوسری کتابیں بھی « حدایق السحر » کے مآخذ کے طور پر استعمال کی ہیں۔ ان کتابوں سے اس نے امثلہ و شواہد نقل کیے ہیں۔ عربی کی ایسی کتابوں میں

(۱) حدایق السحر : ۱۸ (۲) حدایق السحر : ۷۰ (۳) حدایق السحر : ۷۹۔۸۰
(٤) ایضاً : ۷۹-۸۰ (۵) ایضاً : ۸۳

اس نے «رسایل ابوالحسن اھوازی»، «مقامات حریری» اور جراب الدولہ کی کتاب کا ذکر کیا ہے۔ بدیع الزمان ھمدانی، نصر بن حسن مرغینانی، اسمعیل بن عباد، زمخشری، ثعالبی اور باخرزی کی کتابوں کا ذکر تو اس نے نہیں کیا ہے لیکن مصنفین کے نام لینے اور ان سے شواھد نقل کرنے سے قیاس ھوتا ہے کہ اول الذکر تینوں کے رسایل اور زمخشری کی مؤلفات اور خاص طور پر ثعالبی کی «یتیمة الدھر» اور باخرزی کی «دمیة القصر» سے بھی رشید نے استفادہ کیا ہے۔ ان کے علاوہ اس نے صنعت اعنات کے ذیل میں ابوالعلاء معرّی کی ایک کتاب کا ذکر کیا ہے جس کے ہر شعر میں اعنات سے کام لیا گیا ہے۔

اسی طرح صنعت تشبیہ میں علی بن عیسیٰ الرمانی متوفی (۳۸۴ھ) کی کتاب «اعجاز القرآن» کا نام لیا ہے جو قرآن کریم کی تشبیہات پر مشتمل ہے لیکن ان دونوں کتابوں کی نسبت یہ صراحت نہیں کی کہ ان سے اس نے شواھد نقل کیے ھیں یا نہیں، صنعت اعراق میں جاحظ کا قول امرؤ القیس کی نسبت نقل کیا ہے لیکن اس کی کتاب کا نام نہیں لیا ہے۔

«حدایق السحر» کے مطالب یا شواھد کے فارسی مآخذ میں رشید نے کسی کتاب کا نہ نام لیا ہے نہ ذکر کیا ہے۔ «ترجمان البلاغة» کا نام دیباچے میں لیا ہے مگر یہ کہیں نہیں لکھا کہ اس سے نقل و اقتباس کیا ہے۔ اس کے علاوہ اپنے رسالۂ «تصحیفات» اور «متلونات» میں احمد منشوری کی «کنز الغرایب» کا ذکر کیا ہے۔ لیکن ان کے متعلق بھی یہ تصریح نہیں کی کہ ان سے نقل اقتباس کیا ہے یا نہیں۔ اس کی بھی صراحت نہیں کی کہ یہ دونوں کتابیں فارسی کی ھیں یا عربی کی۔ چونکہ دونوں کتابوں کا ذکر رشید نے عربی امثلہ کے بعد اور فارسی امثلہ کے سلسلے میں کیا ہے اور رشید نے کتاب میں یہ التزام کیا ہے کہ عربی امثلہ کے بعد فارسی امثلہ لائی جائیں۔ اس سے قیاس یہی ھوتا ہے کہ یہ دونوں کتابیں فارسی کی ھیں۔ تصحیف کی مثال میں رشید نے اپنا بھی ایک شعر درج کیا ہے اور وہ عربی کا ہے۔

فارسی و عربی کے کچھ امثلہ وشواہد رشید نے کتب بلاغت (معانی و بیان و بدیع) سے بھی نقل کیے ہیں[1] لیکن ان کتابوں کا نام نہیں لیا ہے،

رشید نے فارسی کی امثلہ و شواہد میں اپنے علاوہ حسب ذیل شعراء کا نام لیا ہے: رودکی، منطقی، منوچہری، معزی، عنصری، نطنزی، غضایری، زینبی، فرخی، ابو المعالی رازی، منجیک، عمعق بخاری، قطران تبریزی، ابوالفرج رونی، مسعود سعد، مسعود رازی، عمید کمالی، دقیقی، امیر علی یوزی‌تگین، انباری، بونصر شادی، ابوالعلاء شوستری، محمد بن عبده، احمد منشوری، ابوالفتح بستی، علی‌اسدی، خسروی، ازرقی.

عربی‌نثر اور شعر دونوں کے شواہد میں ثعالبی، نصر بن حسن مرغینانی، حریری، اسمعیل بن عباد کا اور خود اپنا نام لیا ہے.

عربی شعر کے شواہد میں: بوفراس ہمدانی، غزّی، مؤملی کاتب، ابوالفتح بستی، ابو بکر قہستانی، نوقاتی، یزیدی، ادیب ترک، سری‌الرفا موصلی، ابو تمام، متنبی، ابن المعتز، ابوالعلاء معری، ابیوردی، مسعود سعد سلمان، شبل الدولہ، نابغہ ذبیانی، نابغۂ جعدی، بدیع الزمان ہمدانی، جریر، بحتری، بوعثمان خالدی، بلمعانی شابور، بلفرج وأوا الدمشقی، بلفرج ہندو، قاضی منصور ہروی، عباس بن عبد المطلب، کثیر، لبید، قیس مجنون، زہیر، باخرزی، قاضی یحیی، امیر ابو احمد عبد اللہ بن عبد اللہ بن طاہر، امرؤالقیس، فیاض، جاراللہ زمخشری اور بوسعد رستمی کا نام لیا ہے.

«حدایق السحر» کے موضوع کے متعلق بعض مصنفین نے ایک سخت غلط فہمی پیدا کردی ہے، انہوں نے اس کا موضوع عروض بتایا ہے[2] یا کم سے کم اس کے موضوع میں عروض کو بھی شامل سمجھا ہے، حالانکہ اس کتاب میں عروض کے متعلق ایک حرف بھی نہیں ہے.

رشید وطواط نے «حدایق‌السحر» کے دیباچے میں ایک اور کتاب

---

(۱) حدایق السحر: ۸۳

(۲) مقدمۂ غیاث اللغات از ملا غیاث الدین رام پوری؛ قواعد العروض از قدر بلگرامی.

«حدایق‌السحر» سے زیادہ مبسوط تالیف کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے وہ لکھتا ہے :

«واگر در اجل تاخیر باشد و روزگار مہلت دهد و تقدیر یزدانی بروفق مراد انسانی رود کتابی خواهم ساخت محیط بجمیع انواع علم شعر از عروض و القاب و قوافی و محاسن و معایب نظم».

معلوم نہیں رشید اپنا یہ ارادہ پورا کرسکا یا نہیں .

«حدایق السحر» مختصر ہے ، علوم شعر میں صرف ایک علم پر مشتمل ہے لیکن اس کتاب کا موضوع بہت وسیع ہے اور بہ لحاظ موضوع اس کی حیثیت وہی ہے جو شمس قیس کی «المعجم» کی ہے . اگر یہ کتاب رشید نے لکھی ہے تو بڑی مفصل اور مفید کتاب ہوگی مگر افسوس ہے کہ اس کا ذکر کہیں کسی ادبی کتاب میں نہیں ملتا ہے . جس سے خیال یہی ہوتا ہے کہ اس کا یہ ارادہ اس کے دل ہی میں رہا اور اس کتاب کی تالیف کا موقع اس کی درباداری کی مصروفیتوں نے نہ دیا لیکن جن فنون پر اس نے یہ کتاب لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے ان میں ایک فن «عروض» پر علیحدہ سے اس کے رشحات قلم موجود ہیں . ان کے طبع ہونے کا اتفاق تو نہیں ہوا مگر وہ قلمی نسخے کی شکل میں آج بھی محفوظ ہیں . یہ رشحات قلم کسی بڑی تصنیف کی شکل میں نہیں ہیں بلکہ ان کی حیثیت معمولی رسالے کی ہے . عروض پر رشید کے رسالے کا قلمی نسخہ برٹش میوزیم کے کتب خانے میں موجود ہے[1] .

یہ دو ورق کا ایک بہت چھوٹا سا رسالہ ہے جو ایک مجموعے میں شامل ہے اور رشید وطواط سے منسوب ہے اس میں سولہ بحریں ہیں جو فارسی شعراء میں شایع رہی ہیں اس کا مقدمہ اس طرح شروع ہوتا ہے :

«الحمد لله رب العالمین و الصلوة والسلام علی خیر خلقه ، اما بعد این کتاب عروض اشعار است که مولانا عالم فاضل استاذ الشعراء رشید الدین محمد بن علی (؟) الوطواط نوشته و نظم کرده».

(۱) Charles Rieu, *Catalogue of the Persian Mss. in the British Museum* (London, 1883) II, p. 191.

اس کا پہلا قطعہ اس طرح شروع ہوتا ہے۔ در بحر ہزج سالم:

هزج را گر تمام ارکان همی خواهی از و مگذر
بگیر این قطعه را یاد و بکن این وزن را ازبر

یہ رسالہ چند شعروں کی ایک نظم ہے جس میں عروض کی اور زیادہ صحیح یہ کہنا ہوگا کہ بحروں کی تعلیم اس طرح دی گئی ہے کہ جس بحر کا وزن یا ارکان سمجھانے ہیں اس بحر میں شعر کہ دیے گیے ہیں کہ پڑھنے والے کو اس سے ہر بحر کے ارکان اور وزن کا اندازہ ہوجائے جیسے یہی شعر جو بحر ہزج مثمن سالم کے ارکان سمجھانے، کے لیے تصنیف کیا گیا ہے۔ بحر ہزج مثمن سالم ہی میں کہا گیا ہے۔ اس منظوم چھوٹے سے رسالہ کی کوئی فنی اہمیت نہیں ہے۔ یہ صرف چند شعروں کا مجموعہ ہے جو مختلف بحروں میں کہے گئے ہیں۔ دو ورق کی ایسی نظم میں اتنا بڑا استاد اور فاضل فن کی کیا داد دے سکتا ہے۔ اس نظم کو رشید کا محض ایک تفنن طبع سمجھنا چاہیے جو کسی مبتدی کے لیے عمل میں آگیا ہوگا۔ اس منظوم رسالہ کی نسبت یہ ہرگز نہیں سمجھا جاسکتا کہ یہ رشید نے اپنے اس ارادے کی جزوی تعمیل کے طور پر لکھا ہے۔ جو عروض اور دوسرے علوم شعر پر مشتمل کتاب لکھنے کے متعلق اس نے ظاہر کیا ہے۔

مجھے تو اس رسالہ کا رشید الدین وطواط صاحب «حدایق السحر» کی تالیف ہونا بھی مشتبہ معلوم ہوتا ہے۔ نسخہ نویس نے رشید الدین کے نام میں اس کی ابنیت غلط لکھی ہے۔ رشید صاحب «حدایق السحر» کے پورے سلسلۂ نسب میں کسی ایک بھی مورث کا نام «علی» نہیں ہے۔

عروض پر رشید کی اس مشتبہ اور مبتدیانہ تصنیف کے علاوہ اس کی ایک اور تصنیف کا بھی سراغ ملا ہے۔ اس تصنیف کی حیثیت بھی ایک رسالے کی ہے۔ یہ رسالہ ابھی طبع نہیں ہوا ہے۔ اس کی اطلاع مجھے ڈاکٹر پرویز ناتل خانلری کی کتاب «تحقیق انتقادی در عروض پارسی» سے ملی ہے ڈاکٹر پرویز کا شمار اس صدی کے نمایاں ایرانی فضلاء میں ہے۔

انھوں نے عروض پر تحقیقی کام کیا ھے اس فن پران کی یہ دوسری کتاب ھے اس میں فنی رجحانات کی تنقید کی گئی ھے اور مصنف نے عروض کو مختصر کرنے کے لیے ایک اپنا طریقہ بھی تشخیص اوزان و بحور کے لیے پیش کیا ھے. اس کتاب کے آخر میں ان کتابوں کی فہرست دی ھے جس سے مصنف نے کتاب کے مراجع و منابع کا کام لیا ھے۔ ان مراجع و منابع میں یورپین زبانوں کی کتابیں بھی شامل ھیں اور فارسی و عربی کی کتابیں بھی. فارسی و عربی کتابوں کی فہرست مغربی زبانوں کی کتابوں سے علیحدہ دی ھے. مراجع و منابع کے عنوان کے ذیل میں کتب فارسی و عربی کا جو ذیلی عنوان قایم کیا ھے. اس میں رشید کے رسالۂ عروض کا اس طرح ذکر کیا ھے:

«رسالۃ فی فن العروض من تصانیف مولانا رشید الدین الوطواط (نسخۂ قلمی)»۔

خانلری کی کتاب میں اس عبارت کے سوا اورکہیں اس رسالے کا قطعاً کوئی ذکر نہیں ھے. خانلری نے یہ بھی نہیں بتایاکہ یہ قلمی نسخہ کہاں ھے. اس کا کوئی مستقل نام بھی اس عبارت سے معلوم نہیں ھوتا. یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ عبارت اس رسالے کے تعارف کے لیے خانلری نے اپنی طرف سے لکھی ھے یا خود اس قلمی نسخے پر اس رسالے کے تعارف یا نام کے طور پر یہ عبارت لکھی ھوئی تھی اور وھی خانلری نے نقل کردی ھے۔

یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ یہ رسالہ وھی نظم ھے جو برٹش میوزیم کے کتبخانے میں ھےاور جس کا ذکر Rieu کی فہرست کے حوالے سے اوپر درج ھوا ھے یا اس سے مختلف ھے لیکن قیاس یہ ھے کہ یہ رسالہ برٹش میوزیم کے منظوم رسالے کے علاوہ ھے. منظوم رسالہ جیسا ابھی کہا جاچکا ایک مبتدیانہ کوشش ھے اور اتنا مختصر ھے کہ کسی بڑی کتاب میں اس سے اخذو استفادہ کرنا مشکل ھے. زیر نظر رسالے کو خانلری، نے اپنی کتاب کے مآخذ میں شمار کیا ھے. اس لیے یہ سمجھنا چاھیے کہ انھوں نے «تحقیق انتقادی» میں اس رسالہ سے بھی فایدہ اٹھایا ھے. اگرچہ یہ بھی ممکن ھے کہ اس رسالے کی اھمیت کی بنا پر نہیں بلکہ اس کے مصنف (رشید وطواط)

کی اہمیت کی بنا پر خانلری نے اس رسالے کا ذکر کیا ہو اور متن کتاب کے مطالب کے لیے بعض کوئی جزوی استفادہ رسماً اس رسالے سے کیا ہو۔ ان قراین سے مجموعی اثر ذہن پر یہی مترتب ہوتا ہے کہ یہ رسالہ منظوم رسالے کے علاوہ اور اس سے زیادہ اہم ہے اس رسالے کی نسبت بھی یہ ماننے کو طبیعت آمادہ نہیں ہوتی کہ یہ رشید وطواط کے اس ارادے کی جزوی تمیل ہے جو اس نے جملہ علوم شعر پر ایک مبسوط کتاب لکھنے کے متعلق ظاہر کیا ہے۔

محمد بن قیس:

یہ ساتویں صدی ہجری میں علم بدیع کا سب سے اہم مصنف ہے جو عروض کا بھی ماہر ہے اس کی تصنیف کا نام «المعجم فی معاییر اشعار العجم» ہے۔ یہ کتاب صرف علم بدیع پر نہیں ہے بلکہ اس میں علم عروض اور علم قوافی بھی شامل ہے۔ اس کے حالات زندگی کسی کتاب میں نہیں ملتے ہیں چنانچہ قزوینی «المعجم» کے مقدمے میں لکھتے ہیں۔ «از ترجمۂ حیات و شرح حال مصنف این کتاب . . . در ہیچ یک از کتب تاریخ و تذکرہ اطلاعی بدست نیامد» اس کتاب کے دیباچہ اور اصل کتاب کے ایک آدھ مقام سے جو کچھ حالات اس مصنف کے معلوم ہوتے ہیں وہ یہ ہیں:

مصنف «رے» میں پیدا ہوا۔ اولاً خوارزمشاہی دربار سے اس کا تعلق رہا اور محمد بن تکش خوارزمشاہ (۵۹۶ - ۶۱۷ ھ) کا وہ ملازم تھا ۶۰۱ ھ سے پانچ چھ سال تک بخارا میں رہا بعد میں مرو پہنچا۔ ۶۱٤ ھ میں مرو میں تھا۔ اسی زمانہ میں محمد بن تکش عراق کی طرف روانہ ہوا تو خود وہ بھی بادشاہ کے ہمرکاب ہوا اور اس کے ساتھ مرو سے عراق میں آیا۔ یہاں پھر اپنے وطن «رے» کی سکونت اختیار کرنی چاہی اور اہل وعیال اور گھر بار کو خوارزم و خراسان سے رے میں منتقل کرلینے کا ارادہ کیا۔ ۶۱۷ ھ میں رے پہنچا۔ مصنف عراق میں تھا کہ تتاریوں کا حملہ شروع ہوگیا اور انہوں نے ماوراءالنہر خوارزم اور خراسان کو تاخت و تاراج کردیا۔ ۶۱۷ ھ میں قلعۂ فرزین میں تتاریوں کے مقابلہ میں خوارزمشاہ کو شکست ہوئی تو مصنف بادشاہ کے ہمرکاب تھا۔ مصنف نے بادشاہ کا

عراق کے لیے روانہ ہوتا اور اپنا «مرو» سے بادشاہ کے ساتھ نکلنا اور عراق پہنچنا اور قلعۂ فرزین کی جنگ میں اس کے ساتھ ہونا، یہ واقعات اس طرح بیان کیے ہیں کہ مصنف اور بادشاہ دونوں کا عراق پہنچنا اور ٦١٤ھ سے ٦١٧ھ تک دونوں کا عراق میں مسلسل رہنا ظاہر ہوتا ہے. مگر یہ غلط ہے. مصنف عراق پہنچا اور وہیں رہ پڑا مگر بادشاہ راستہ سے واپس ہوگیا. جب ٦١٧ھ میں تتاریوں کے حملہ سے جان بچا کر دوبارہ بادشاہ عراق کی طرف روانہ ہوا ہے. اس وقت عراق میں پھر مصنف بادشاہ کا ہمرکاب ہوا اور اسی ہمراہی میں قلعۂ فرزین کی جنگ پیش آئی.

مصنف دیباچہ میں لکھتا ہے کہ اگرچہ ٦٣٠ھ میں فتنۂ تتاری کی طرف سے بیشتر ممالک اسلامیہ کو امن حاصل ہوگیا تھا اور بادشاہ کے بعض فرزندوں کی طرف سے قیام امن کی امید پیدا ہوچلی تھی لیکن چونکہ اس نے متعدد شہروں میں اپنی آنکھوں سے تتاریوں کے ہاتھوں قتل عام دیکھا تھا اور خود بھی دو ایک بار رے کے شحنوں کے ہاتھوں گرفتار ہوگیا تھا اور بمشکل جانبر ہوا تھا. اس کو عراق کی حالت سے اطمینان نہیں ہوتا تھا اور تتاریوں کی مراجعت کا خوف اس کے دل سے نہیں نکلتا تھا آخر ان حالات سے تنگ آکر راستوں کے خطرناک ہونے کے باوجود مصنف عراق سے فارس چلا گیا.

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فتنۂ تتار کے زمانہ میں عراق کے متعدد شہروں میں منتقل ہوتا رہا اور خود رے میں بھی رہا. غالباً یہ وہ حالت ہوگی کہ جب تاری خوارزمشاہ ان کے ڈر سے شہر بہ شہر مارا مارا پھر رہا تھا. مصنف اس وقت بادشاہ کے ہمرکاب ہوگا. اور اسی کے ساتھ شہر بہ شہر منتقل ہوتا رہتا ہوگا. اور اسی ہمراہی میں قلعۂ فرزین کا مقابلہ مصنف کی نظر سے گذرا ہوگا. اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ٦٢٥ھ تک مصنف عراق ہی میں رہا اور ٦٢٠ھ کے بعد تھوڑی ہی مدت میں وہ عراق سے فارس میں منتقل ہوا. لیکن صحیح سال فارس میں اپنے منتقل ہونے کا اس نے نہیں لکھا ہے.

فارس پہنچکر اس نے بادشاہ فارس اتابک سعد بن زنگی کی ملازمت اختیار کرلی اور دارالخلافه شیراز میں سکونت پذیر ہوا بادشاہ نے اس کا بڑا اعزاز و اکرام کیا اور مصنف بہت جلد اس کے مقربان خاص میں داخل ہوگیا اور حاجب کے عہدہ پر مامور ہوگیا اس کا شمار خاص حاجبوں میں ہوتا تھا۔ مصنف پانچ سال اس بادشاہ کی ملازمت میں رہا۔ اس کے انتقال کے بعد اس کے فرزند اتابک ابوبکر بن سعد بن زنگی کے زمانہ میں بھی مصنف شیراز میں رہا۔ اور اسی کے زمانہ میں کتاب «المعجم فی معاییر اشعار العجم» مکمل کی اور اسی کے نام سے منسوب کی۔ دیباچہ کی تحریر کے وقت مصنف نے ابوبکر بن سعد زنگی کی تسخیر ممالک اور توسیع سلطنت کے متعلق لکھا ہے کہ اب تک بحرین، عمان، کیش، اور خلیج فارس کے تمام بندرگاہ، جزیرے اور آبادیاں جو آب بصرہ سے سواحل ہند تک واقع ہیں تسخیر ہوکر ملک فارس میں شامل ہوچکی ہیں. یہ توسیع و تسخیر قاضی احمد غفاری کی «تاریخ جہان آرا» کے مطابق ابوبکر کے سال جلوس یعنی ٦٢٨ ھ کے واقعات ہیں۔ لہذا مصنف ابوبکر کے زمانۂ حکومت میں ٦٢٨ ھ تک زندہ تھا اور شیراز میں موجود تھا۔

قزوینی مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ اگرچہ اور تاریخوں میں ان فتوحات کا سن نہیں لکھا ہے لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فتوحات جلوس ابوبکر کے چند سال بعد ہوئی ہیں۔ اول تو قزوینی نے کوئی قرینہ نہیں لکھا ہے۔ پھر کوئی تاریخی شہادت بھی ان کی رائے کی تائید نہیں کرتی ہے۔ اس لیے قزوینی کی رائے ماننے کے قابل نہیں ہے۔ لیکن اگر ان کی رائے مان لی جائے تو ہمارے علم میں مصنف کے قیام شیراز کی مدت ایک آدھ سال تک اور بڑھ جاتی ہے یعنی ٦٢٩ ھ یا ٦٣٥ ھ. تک وہ شیراز میں موجود تھا۔ بہرحال ٦٢٨ ھ یا ٦٣٥ ھ کے بعد کے حالات مصنف کے متعلق اس کی اس کتاب سے بھی نہیں معلوم ہوتے ہیں۔ ان مختصر اور منتشر حالات کے سوا ہمیں مصنف کی زندگی کے متعلق کچھ علم نہیں۔

قزوینی نے مقدمہ میں مصنف کے عراق سے فارس منتقل ہونے اور

سعد بن زنگی کی ملازمت اختیار کرنے کا سال ۶۲۳ھ متعین کیا ہے۔ مصنف نے یہ سن خود نہیں لکھا ہے۔ اس کے لیے قزوینی کا استدلال یہ ہے کہ سعد بن زنگی کی وفات کے بعد مصنف اس کے فرزند ابو بکر کی ملازمت میں بدستور رہا ہے اور چونکہ سعد بن زنگی کا سن وفات ۶۲۸ھ ہے اور وہی ابو بکر کا سال جلوس ہے اور مصنف نے سعد بن زنگی کی وفات تک اس کے دربار میں اپنی مدت ملازمت پانچ سال لکھی ہے۔ اس لیے مصنف کا قیاس پہنچنا اور سعد بن زنگی کے دربار میں ملازم ہونا ۶۲۸ھ سے پانچ سال پہلے یعنی ۶۲۳ھ میں ثابت ہوتا ہے۔ قزوینی کی یہ رائے اور ان کا یہ استدلال صحیح نہیں ہے اس استدلال کے لیے سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ مصنف کا سعد بن زنگی کے دربار میں ملازم رہنا سعد بن زنگی کی وفات تک ثابت ہو یا یہ ثابت ہو کہ مصنف نے ابو بکر کی بھی ملازمت کی۔ ان دونوں میں سے ایک واقعہ بھی صحیح نہیں ہے۔ مصنف نے یہ ضرور لکھا ہے کہ وہ پانچ سال تک سعد بن زنگی کا ملازم رہا لیکن قزوینی نے یہ غلط لکھا ہے کہ مصنف نے اپنی یہ مدت ملازمت سعد بن زنگی کی وفات تک لکھی ہے۔ مصنف نے یہ کہیں نہیں لکھا ہے ابو بکر کے دربار میں اپنا ملازم ہونا بھی مصنف نے کہیں نہیں لکھا ہے۔ مصنف کے دیباچہ میں دو موقعوں پر ابوبکر کے حق میں دعا و ثنا ملتی ہے۔ ایک موقع پر جب فارس میں آنا اور سعد بن زنگی کی ملازمت اختیار کرنا بیان کرتا ہے تو سعد بن زنگی کی دعا و ثنا کرتا ہے اور اس کی دعاء مغفرت کے سلسلے ہی میں ابوبکر کے حق میں دعاء درازی مدت اور اس کی مدح سرائی شروع کردیتا ہے جو دس گیارہ صفحوں میں پھیلی ہوئی ہے دوسرے موقع پر جب کتاب کی تکمیل و تسمیہ کا ذکر کرتا ہے تو پھر ابوبکر کی دعا و ثنا کرتا ہے جو ایک صفحہ پر مشتمل ہے۔ اس موقع پر اپنی کتاب بھی اس کے نام سے منسوب کرتا ہے۔ اس طویل مدح کے باوجود جو مصنف ابوبکر کی کرتا ہے۔ یہ کہیں نہیں لکھتا ہے کہ وہ ابوبکر کا ملازم ہے۔ حالانکہ سعد بن زنگی کا ذکر آیا تھا تو مصنف نے اچھی طرح

اور تفصیل سے اس کے دربار میں اپنا ملازم ہونا بیان کردیا تھا۔ ابوبکر کی اس مدح و ثنا میں جو الفاظ زیادہ سے زیادہ اس قیاس میں مدد کرسکتے ہیں کہ وہ ابوبکر کا بھی ملازم تھا یہ ہیں:

«طراز آغاز آں (کتاب) دعاء دولت و ثناء حضرت خداوند زادہ ... سلغر شاہ بن سعد. . . ساختہ و بنام مبارکش پرداختہ چہ میل طبع لطیفش بمطالعۂ لطائف کتب دانستہ ام و التفات خاطر عاطرش بمطالعۂ نوادر علوم دیدہ . . . و امیدوارم کہ بہ میامن دعاء این خاندان بادشاہی و دولت و برکت حق گذاری نعمت این دودمان غریب نوازی و عاطفت از وقیعت طاعنان مصون ماند».

یہ اس مدح کے الفاظ ہیں جو دوسرے موقع پر کی گئی ہے۔ یہ الفاظ ہرگز اس قیاس کے لیے کافی نہیں ہیں کہ مصنف ابوبکر کا ملازم تھا. مصنف کا یہ لکھنا کہ اس کو بادشاہ کے مطالعہ کتب کے شوق کا علم ہے. اس پر بھی مبنی ہوسکتا ہے کہ اہل ملک خصوصاً خواص بادشاہ کے رجحانات سے درباداری کے تعلق کے بغیر واقف ہوتے ہیں مصنف کا یہ لکھنا کہ مطالعۂ علوم کی طرف اس نے بادشاہ کا التفات خاطر دیکھا ہے. اس پر بھی مبنی ہوسکتا ہے کہ جب مصنف ابوبکر کے باپ کا ملازم تھا اور ابوبکر اس وقت شہزادہ تھا۔ اس وقت بادشاہ کا یہ التفات خاطر دیکھنے کے اتفاقات ہوتے رہے ہوں گے یا اس سے زیادہ سے زیادہ یہ مان لیا جائے کہ مصنف ابوبکر کے بادشاہ ہوجانے کے بعد کبھی کبھی اس کے دربار میں بلایا جاتا تھا۔ دربار کی آمد و رفت کے لیے ملازمت کا تعلق ضروری نہیں ہے. بہر حال مصنف ابوبکر کے باپ کے امراء میں تھا۔ پھر دارالخلافہ میں ہی مقیم تھا . ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی دربار میں آمد و رفت رہی ہوگی کسی شخص کا اپنے آپ کو کسی بادشاہ کے خاندان کا دعاگو اور اس خاندان کی نعمتوں کا حق گذار کہنا اس سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ایسا شخص اس بادشاہ کا ملازم ہے۔ یہ عام بات ہے اور تعلق خدمت کے بغیر بھی اس طرح کی بات بادشاہ کے حق میں ہر

ثناہ خواں کہہ سکتا ہے۔ اور کہتا ہے۔ اور پھر مصنف کو تو اس لیے بھی کہنا چاہیے کہ وہ بادشاہ کے باپ کا ملازم رہا ہے اور اس پر اس کے باپ کا حق نمک ہے اب صرف یہ بات رہ جاتی ہے کہ مصنف نے اپنی کتاب ابو بکر کے نام سے منسوب کی ہے۔ یہ نسبت بھی ملازمت کا ثبوت نہیں ہوسکتی۔ بہت سے مصنفین بادشاہوں کے نام پر کتابیں لکھتے تھے حالانکہ وہ ان بادشاہوں کے ملازم نہیں تھے یہ اس زمانے کی عام رسم تھی کہ جس طرح کتاب کا حمد و نعت سے شروع ہونا ضروری تھا اسی طرح سبب تالیف تک پہنچتے پہنچتے بادشاہ وقت کی مدح کرنا اور کبھی کبھی اس کے نام سے کتاب کو منسوب کرنا بھی ضروری تھا۔ یہ گویا تصنیف و تالیف کے آداب تھے۔

مصنف کا یہ لکھنا کہ اگرچہ ٦٢٠ ھ میں تتاریوں کے طرف سے امن ہوگیا تھا مگر عراق کے انقلاب اور گذشتہ واقعات سے وہ اتنا گھبرا گیا تھا کہ عراق سے فارس چلا گیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قیام امن اور مصنف کی فارس میں منتقلی ایک ہی زمانہ یعنی ٦٢٠ ھ کے واقعات ہیں۔ اگر یہ دو علیحدہ واقعے ہیں تو اپنی روانگی فارس کے سلسلہ میں مصنف کو ٦٢٠ ھ کے قیام امن یا تخفیف بدامنی کے ذکر کی کیا ضرورت تھی۔ خصوصاً جبکہ بدامنی کی کمی اس کی روانگی فارس کا محرک بھی نہیں ہوسکتی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف ٦٢٥ ھ کو اپنی روانگی فارس کا سال بتانا چاہتا ہے۔ اور تخفیف بدامنی کا ذکر جو خود بھی اس سن کا واقعہ ہے جملہ معترضہ کے طور پر کر گیا ہے۔

مصنف کا یہ بیان اور اس کا یہ نتیجہ نیز اس کا سعد بن زنگی کی ملازمت کا ذکر کرنا اور ابوبکر کی ملازمت کا ذکر نہ کرنا، سعد بن زنگی کے دربار میں اس کی پنج سالہ مدت ملازمت کے متعلق یہ صراحت نہ ملنا کہ وہ سعد بن زنگی کی وفات تک ختم ہوتی تھی ان واقعات کو ملاکر دیکھئے تو دو نتیجے نکلتے ہیں ایک یہ کہ مصنف کا فارس منتقل ہونا اور سعد بن زنگی کے دربار میں ملازم ہونا ٦٢٠ ھ کا واقعہ ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ

ابوبکر کے دربار میں ملازم نہیں رہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف ۶۲۰ ھ سے ۶۲۵ ھ تک سعد بن زنگی کے دربار میں ملازم رہا۔ اس کے بعد ملازمت دربار داری کے فرائض سے سبکدوش ہوکر خانہ نشین ہوگیا نہ اس کے بعد سعد بن زنگی کے زمانہ میں اس نے ملازمت اختیار کی نہ ابو کر کے زمانہ میں۔

« المعجم » مدتوں کمیاب رہی۔ اس کے صرف چند قلمی نسخے کتبخانوں میں محفوظ ہیں۔ یہ پہلی بار پروفیسر ادوارد براؤن کی سعی اور ان کے لائق شاگرد مرزا محمد خاں معروف بہ محمد بن عبدالوہاب قزوینی کی تصحیح و تحشیہ اور مقدمہ کے ساتھ ۱۳۲۷ ھ مطابق ۱۹۰۹ میں مطبع کاثولیکیہ بیروت میں طبع ہوکر شائع ہوئی۔ قزوینی نے اسے تین قلمی نسخوں کی مدد اور مقابلہ سے مرتب کیا ہے۔ برٹش میوزیم لندن کا نسخۂ، کتبخانۂ خدا بخش خان بانکی‌پور (پٹنہ) کا نسخہ، کتبخانۂ ایا صوفیہ استانبول کا نسخہ اس اشاعت کا اصلی مبنی برٹش میوزم کا نسخہ ہے۔

دوسری بار یہ کتاب مدرس رضوی استاد دانشگاہ تہران نے خرداد ۱۳۳۸ ھ میں دانشگاہ کے مطبع میں طبع کراکے شائع کی یہ قزوینی ہی کے مرتبہ نسخہ کی دوسری اشاعت ہے۔ قزوینی کے مقدمہ، حواشی اور متن کو قائم رکھتے ہوئے اس پر صرف اتنا اضافہ کیا ہے کہ قزوینی کے مرتبہ نسخہ کا مقابلہ چھ اور قلمی نسخوں سے کرکے جن میں پانچ اُبھی ایرانی کتبخانوں میں مل گئے تھے۔ اور ایک یاصوفیا کے کتبخانہ کا عکس ہے۔ نسخوں کے اختلافات اور بدل کے متعلق کچھ حواشی اپنی طرف سے بڑھا دیے ہیں نیز بعض الفاظ کے معانی حاشیہ میں دیدیے ہیں۔ قزوینی کے مرتبہ متن میں قلم نہیں لگایا ہے۔ سوا ان چند مقامات کے جہاں کوئی غلطی یا سقوط بہت نمایاں تھا اورکسی قلمی نسخہ سے درست ہوسکتا تھا۔ قزوینی کے مقدمہ کے علاوہ ایک مقدمہ خود بھی لکھ‌کر شامل کتاب کیا ہے۔ میرے سامنے یہ دوسری اشاعت ہے۔ اس کتاب پر عبدالوہاب قزوینی اور مدرس رضوی دونوں کے مقدمے ہیں اور ضروری معلومات پر مشتمل ہیں۔

یہ کتاب موضوع کے لحاظ سے تین حصوں پر مشتمل ہے۔ عروض

قافیہ اور علم شعر (نقد شعر) تیسرے حصے میں صفحہ ۳۲۸ سے صفحہ ٤٣١ تک علم بدیع ہے اور یہی اس وقت ہمارا اصلی موضوع ہے۔ اس طرح علم بدیع پر اس کتاب میں ۱۰۳ صفحے ہیں۔

«المعجم» کا سن تصنیف، موضوع اور نام بھی تفصیل چاہتا ہے مصنف نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ ٦١٤ھ میں جب وہ مرو میں تھا۔ اس کے ایک دوست نے اُس کو توجہ دلائی کہ عربی اور فارسی شاعری کے معاییر (اصول) اور محاسن و معایب پر ایک کتاب لکھے اسکی فرمائش پر مصنف نے فوراً عربی و فارسی اشعار کے عروض قوافی اور فن نقد پر کتاب لکھنی شروع کردی اور اس کے ابواب کا ایک خاکہ تیار کرلیا۔

اس کے بعد کام رکا رہا ٦١٧ھ میں قلعۂ فرزین کی جنگ میں یہ ناتمام کتاب جو مصنف کے ساتھ تھی تمام کی تمام کھوگئی اور بہت مدت کے بعد اس کے صرف چند اجزاء اس علاقہ کے بعض کسانوں سے مصنف کو دستیاب ہوئے۔ مصنف شیراز پہنچا تو یہی چند اجزاء اس ناتمام کتاب کے اس کے پاس محفوظ تھے۔

شیراز میں ابو بکر کے دور حکومت میں فضلاء شیراز نے مصنف پر زور دیا کہ وہ اس کی تکمیل کرے چنانچہ مصنف نے اس کی تکمیل کی طرف توجہ کی اور تھوڑی ہی مدت میں کتاب مکمل کردی۔ اس طرح اس کتاب کی تصنیف ٦١٤ھ میں شروع ہوئی۔ ٦١٤ھ سے ٦٢٨ھ تک اس کی تکمیل رکی رہی۔ کتاب عربی زبان میں تھی اور اس میں بحث عربی اور فارسی دونوں کے فنون ثلاثہ (عروض، قافیہ، اور نقد شعر) سے کی گئی تھی اس طرح کہ عربی شاعری کے مباحث کی مثال میں عربی شعر پیش کیے گئے تھے۔ یعنی مطالب کی عربی عبارت کے ساتھ شواهد فارسی اور عربی اشعار کے مربوط کیے گئے تھے۔ کتاب کی تکمیل کے بعد مصنف کے بعض احباب نے درخواست کی کہ اس کتاب میں سے فارسی کے فنون ثلاثہ کے مباحث اور اشعار الگ الگ کرکے ایک دوسری کتاب میں جس کی عبارت فارسی ہی میں ہو جمع کردیئے جائیں۔

مصنف نے اس طبقۂ احباب کی یہ درخواست قبول کی اور اس بڑی کتاب میں جتنے مباحث فارسی شاعری کے ان فنون ثلاثہ سے متعلق تھے اُنہیں اس مختصر کتاب میں جمع کردیا۔ اور اس کا نام «المعجم فی معاییر اشعار العجم» رکھا۔

مصنف کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جن فنون پر زیر نظر کتاب «المعجم» مشتمل ہے انہیں فنون پر اولاً اس نے بڑی کتاب تصنیف کی تھی جو عربی اور فارسی دونوں کی شاعری سے متعلق تھی بعد میں اس بڑی کتاب سے وہ مباحث جو فارسی شاعری سے متعلق تھے الگ کرکے فارسی میں ترجمہ کردیئے اور بڑی کتاب کے فارسی اشعار کے شواھد بھی اس ترجمہ کے ساتھ جمع کردیئے۔ اس ترجمہ کا نام اس نے « المعجم فی معاییر اشعار العجم » رکھا ۔ اس طرح « المعجم » مصنف کی بڑی کتاب کا اختصار اور فارسی ترجمہ ہے اور صرف فارسی شاعری کے فنون پر مشتمل ہے ۔ بڑی کتاب مصنف نے ٦١٤ ھ میں لکھنی شروع کی تھی جس کی تکمیل ابوبکر کے زمانہ تک جاری رھی۔ ابو بکر کے زمانہ میں اس کی تکمیل کا مصنف کو دوبارہ خیال آیا۔ دیباچہ میں مصنف نے ابوبکر کی حدود حکومت کی توسیع بحرین ، عمان ، کیش اور خلیج فارس کے تمام بندرگاہ اور جزیروں تک لکھی ہے۔ یہ واقعہ قاضی احمد غفاری کے مطابق ٦٢٨ ھ کا ہے اور یہی ابو بکر کا سال جلوس ہے ۔ اس لیے ٦١٤ ھ کے بعد مصنف نے بڑی کتاب کی تکمیل کی طرف دوبارہ توجہ ٦٢٨ ھ میں کی اور اسی ٦٢٨ ھ میں اسے مکمل کردیا ۔ لہذا بڑی کتاب کا زمانۂ تصنیف ٦١٤ ھ تا ٦٢٨ ھ ہے ۔ اس چھوٹی کتاب « المعجم » کا سن تصنیف ایک لحاظ سے صرف ٦٢٨ ھ کو کہہ سکتے ہیں کہ اسی سال میں بڑی کتاب مصنف نے مکمل کی اور اسی سال اس کی تکمیل کے بعد اس سے مقتبس کر کے « المعجم » مرتب کی۔ لیکن اس لحاظ سے کہ اس کے اصلی مآخذ کی تصنیف ایک حد تک ٦١٤ ھ میں ہوچکی تھی اور اس وقت سے « المعجم » کے مضامین بڑی کتاب میں موجود تھے۔ « المعجم » کا زمانۂ تصنیف بھی وھی ہے جو بڑی کتاب کا یعنی ٦١٤ ھ ـ ٦٢٨ ھ مصنف کے اس بیان سے یہ بھی قیاس ہوتا ہے ۔

که جس طرح اس نے بڑی کتاب میں سے مقتبس کرکے ایک علیحدہ کتاب عربی شاعری کے انہیں فنون ثلاثہ پر مرتب کی ہوگی اور اس کا نام «المعجم» کے مقابلہ پر تناسب ترکیب کے لحاظ سے «المعرب فی معاییر اشعار العرب» رکھا ہوگا ۔ اصل بڑی کتاب بھی جو عربی اور فارسی دونوں کے فنون ثلاثہ پر مشتمل تھی بدستور رہی ہوگی اور اس کے نام میں دونوں زبانوں کی رعایت ہوگی لہذا ان فنون ثلاثہ پر مصنف کی تین کتابیں ہونی چاہئیں ۔ ۱۔ اصل بڑی کتاب ۲۔ بڑی کتاب کا فارسی ترجمہ و اقتباس یعنی المعجم ۳۔ بڑی کتاب کا عربی اقتباس ۔ اس قیاس کی تائید «المعجم» کے دوسرے مقامات سے ہوتی ہے ، بحر مشاکل کے بیان میں مصنف ایک وزن میں بعض شعراء کا مشاکل اور ہرج کو مخلوط کرنے کا عمل غلط بتاتے ہوئے «المعجم» کے صفحہ ۱۷۵ پر لکھتا ہے :

« و من چون دریں فن شروع کردم و در تالیف کتاب الکافی فی العروضیین و القوافی بدیں فصل رسیدم کافۂ فضلاء و عامۂ شعراء فارس و عراق باتفاق دریں باب ( یعنی اس خلط کے غلط ہونے کے بارے میں ) مرا خلاف کردند و بر تصویب ایشان و تخطیۂ من اصرار نمودند » ۔

یہاں مصنف نے اپنی کتاب « کتاب الکافی فی العروضیین و القوافی » کا ذکر کیا ہے ۔ اس مقام کے سوا اور کہیں اس کتاب کا ذکر نہیں آیا ہے ۔ اس کتاب کے نام میں عروضیین کا صیغہ تثنیہ صاف بتا رہا ہے کہ یہ کتاب عربی اور فارسی دو زبانوں کے فن سے متعلق ہے ۔ نیز «بدیں فصل رسیدم» کے فقرہ سے ظاہر ہے کہ «المعجم» کی جس فصل یعنی مشاکل میں یہ عبارت مصنف نے لکھی ہے ۔ مصنف کی کتاب « کتاب الکافی » میں بھی اس موقع پر یہی فصل ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو ابواب و فصول ( مباحث ) «المعجم» میں ہیں وہی « الکافی » میں ہیں ۔ مصنف نے اپنی بڑی کتاب کے بارے میں بھی یہی لکھا ہے کہ اس کے مباحث وہی ہیں جو « المعجم » کے ۔ اور اس میں اور « المعجم » میں صرف یہ فرق ہے کہ «المعجم» صرف فارسی زبان کے نمونوں کے متعلق ہے اور بڑی کتاب فارسی اور عربی دونوں زبانوں

کے فنون سے تعلق رکھتی ہے لہذا یہی «کتاب الکافی فی العروضین و القوافی» مصنف کی وہ بڑی کتاب ہے جس کا اختصار اور ترجمہ «المعجم» ہے۔ «کتاب الکافی» کو مصنف کی بڑی کتاب اور «المعجم» کا مآخذ سمجھنے میں ایک یہ شبہہ حائل ہوتا ہے کہ مصنف نے بڑی کتاب کو دو زبانوں کے فنون ثلاثہ یعنی عروض، قوافی اور نقد شعر پر مشتمل بتایا ہے۔ اور «المعجم» کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نقد شعر میں اکثر علم بدیع کا حصہ ہے اس لیے «الکافی» میں بھی دو زبانوں کے عروض، قوافی اور علم بدیع یا نقد شعر تینوں فن ہونے چاہییں۔ لیکن «الکافی» کے نام میں فن صرف دو مذکور ہیں اور تثنیہ صرف ایک فن (عروض) کا ظاہر کیا گیا ہے۔ یہ شبہہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا ہے۔ مجاز مرسل کی اقسام میں ایک قسم تسمیۃ الکل بالجزء بھی ہے۔ یہ ایک اسلوب بیان ہے جس کے رو سے کسی کل کا نام اس کے کسی جزو پر رکھا جاتا ہے اسی اسلوب پر مصنف نے اپنی اس کتاب کا نام رکھدیا۔ قوافی کا صیغہ کافی کے قافیہ کے لیے استعمال کیا اور عروضین سے اس طرف اشارہ ہوگیا کہ جس طرح اس کتاب میں عروض دو ہیں یعنی دو زبانوں کے ہیں اسی طرح قوافی بھی دو زبانوں کے ہیں۔ قافیتین لانے میں یہ قباحت بھی تھی کہ اس سے دو زبانوں کے قافیوں کے فن کا مفہوم نکلنے کی بجائے یہ مفہوم زیادہ نکلتا ہے کہ کوئی دو مخصوص قافیہ مراد ہیں۔ یعنی دو ایسے لفظ مراد ہیں جو قافیہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

«کتاب الکافی» سے مآخوذ دوسری چھوٹی کتاب جو عربی کے فنون پر مشتمل ہے میرے قیاس کردہ نام کے ساتھ دو جگہ «المعجم» میں مذکور ہے۔ ایک جگہ ص ۲۱۷ میں پورے نام سے دوسری جگہ ص ۲۷۳ میں مختصر نام سے۔ چنانچہ ص ۲۱۷ میں قافیہ کی بحث میں فارسی شعراء کے ایک التزام کا ذکر کرتے ہوئے عربی شعرا کے التزام کا بھی ذکر کرتا ہے۔ اور عربی شعراء کے اس التزام کی توجیہ میں لکھتا ہے کہ «سبب و علت آں در کتاب المعرب فی معاییر اشعار العرب بیان کردہ ایم»۔ ص ۲۷۳ میں قافیہ کی

بحث میں عربی اشعار کے « حدود قوافی » متکاوس، متراکب وغیرہ کی کیفیت استعمال فارسی اشعار میں بتانے کے سلسلے میں لکھتا ہے ۔ « عدد قوافی در اشعار عرب سی و پنج است چنانک در کتاب معرب شرح داده آمده است» یہ « معرب » اسی « المعرب فی معاییر اشعار العرب » کا مختصر نام ہے ۔

«المعجم» کا نام جیسا اوپر ذکر ہوچکا محمد بن قیس نے « المعجم فی معاییر اشعار العجم» ہی رکھا ہے ۔ برٹش میوزیم اور کتبخانہ ذکاءالملک فروغی کے نسخوں کے کاتبوں نے بھی اس کا یہی نام لکھا ہے اکثر مصنفین بھی اس کا نام یہی لیتے ہیں یا اسے «المعجم» کہتے ہیں جو ظاہر ہے اسی نام کا اختصار ہے اور اس نام سے کوئی مختلف نام نہیں ہے لیکن مفتی سعد اللہ مرادآبادی اور سید غلام حسنین قدر بلگرامی اس کا نام معیارالمعجم یا معیار معجم بتاتے ہیں ۔

«المعجم» کے نام کے سلسلے کی ایک بحث اور رہ جاتی ہے اور وہ « حدایق المعجم » کی ہے ۔ قزوینی لکھتے ہیں کہ «حدایق المعجم» کا ذکر مفتی محمد سعداللہ کی «میزان الافکار» اور صاحب «غیاث اللغات» کے رسالہ «معراج العروض» میں آیا ہے ۔ اس بنا پر وہ اسے شمس قیس کی تصنیف کہتے ہیں انہوں نے برٹش میوزیم کے فارسی مخطوطات کی فہرست کے مرتب چارلس ( Rieu ) کے قول کے حوالہ سے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ غالباً یہ کتاب «المعجم» کا اختصار ہے[۱]. صاحب «غیاث اللغات » نے اسے اپنے رسالہ کے مآخذ میں شمار کیا ہے اور محمد بن قیس کی تصنیف بتایا ہے[۲]. « المعجم فی معاییر اشعار العجم» کا کہیں نام نہیں لیا ہے ۔ تلاش سے «حدائق المعجم» کا ذکر قزوینی کی ان بتائی ہوئی دو کتابوں کے علاوہ اور بھی کتابوں میں ملتا ہے ۔ مثلاً شرح قصائد انوری مصنفه میر ابوالحسن حسینی فراهانی[۳]، کتاب «کشاف

(۱) مقدمۂ المعجم : یا

(۲) مدرس رضوی نے مقدمه المعجم میں یہ غلط لکھا ہے کہ معراج العروض میں بتکرار حدایق المعجم کا نام لیا گیا ہے حدایق المعجم کا نام اس رسالہ میں صرف ایک بار آیا ہے ۔

(۳) مدرس رضوی «مقدمه المعجم» میں لکھتے ہیں کہ اس شرح میں شمس قیس کی «حدائق المعجم» سے مطلب نقل کیے گئے ہیں ۔

اصطلاحات الفنون» مصنفه شیخ محمد علی فاروقی الحنفی التهانوی[1] «قواعد العروض» مصنفه سید غلام حسنین قدر بلگرامی[2]. ان کتابوں میں «حدایق المعجم» کا جس طرح ذکر آیا ہے اس سے اس کتاب کے متعلق تین باتیں قطعی طور پر ثابت ہیں۔

۱۔ یہ کسی اور مصنف کی کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے۔

۲۔ شمس قیس اور المعجم سے اس کا ضرور کوئی تعلق ہے۔

۳۔ یہ شمس قیس کی کوئی مستقل تصنیف «المعجم» سے الگ اور اس کے علاوہ نہیں ہے۔

---

(۱) شیخ محمد علی بن علی بن القاضی محمد حامد بن محمد صابر الفاروقی الحنفی التھانوی، اس مصنف کی متذکرہ کتاب کے متعلق مدرس رضوی «مقدمۂ المعجم» میں لکھتے ہیں کہ اس کی جلد اوّل اسلامبول میں اور مکمل کتاب دوسری بار ہندوستان میں طبع ہوئی۔ عروض و قافیہ کے اصطلاحات اس میں شمس قیس کی حدائق المعجم سے نقل کی گئی ہیں۔

(۲) اس کتاب میں پہلی بار صفحہ ٤۹ پر زحاف تخنیق کے سلسلے میں حدائق المعجم کا نام اس طرح آیا ہے، کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ قدر صاحب کے نزدیک حدائق المعجم محمد بن قیس کی تصنیف ہے یا کسی اور کی۔ تخنیق کے تلفظ کے لیے صاحب «حدائق المعجم» سے استناد کیا ہے اور اس کی تعریف کے لیے «محمد بن قیس» سے۔ اس صورت میں محمد بن قیس سے مراد اس کی کتاب المعجم ہوسکتی ہے۔ دوسری بار ص ۱۱۸ میں قدر بلگرامی نے اسی کتاب کے مآخذ گناتے ہوئے «معیار المعجم» (اوپر ذکر آچکا ہے کہ قدرؔ بلگرامی المعجم کو معیار المعجم کہتے ہیں) کے علاوہ اس کتاب کا نام بھی اپنے مآخذ میں لیا ہے وہاں بھی اس کے مصنف کا نام نہیں لیا ہے اگر «حدائق المعجم» اختصار ہے المعجم کا تو المعجم کو مآخذ کہنے کے بعد «حدائق المعجم» کو مآخذ کہنے کی کیا ضرورت اور کیا موقع؟ اس سے شبہہ ہوتا ہے کہ «حدائق المعجم» کسی اور مصنف کے قلم سے المعجم کی شرح ہے۔ شرح میں چونکہ اصل کے علاوہ بھی مطلب ہوتے ہیں اس لیے اس کو کسی کتاب کے مآخذ میں اصل کے علاوہ شمار کیا جاسکتا ہے؟ تیسری بار ص ٤٤۰ میں صراحۃً قدر بلگرامی نے اسے ابن قیس کی تصنیف کہا ہے چنانچہ لکھتے ہیں «ابن قیس، حدایق المعجم میں کہتا ہے»،

اب یہ بات سمجھنے کو رہ جاتی ہے کہ «المعجم» سے اس کا کیا تعلق ہے اور «حدائق المعجم» اس کا نام کہاں سے آیا نیز جب «المعجم» سے اس کا تعلق (اختصار وغیرہ کا) ہے اور یہ خود کوئی مستقل تصنیف محمد بن قیس کی نہیں ہے تو مصنفین اسے محمد بن قیس سے کیوں منسوب کرتے ہیں۔

مسٹر ریو (Rieu) اور ان کی بنا پر قزوینی بھی جیسا اوپر ذکر ہوا اسے «المعجم» کا اختصار سمجھتے ہیں۔ ایسی صورت میں اس کے متعلق دو خیال ہوسکتے ہیں ایک یہ کہ اس میں «المعجم» کے تینوں فن موجود ہیں۔ مگر ہر فن مختصر طور پر شواهد یا شواهد و مطالب دونوں میں سے کچھ کچھ حذف کرکے اس میں جمع کیے گئے ہیں۔ اس خیال کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ ایسا ہوا بھی ہے چنانچہ اس کا ایک اختصار «میزان الاوران و لسان القلم در شرح الفاظ عجم» (جس کا ذکر آگے آتا ہے) محفوظ ہے۔ دوسرا یہ خیال کہ اصل مطالب و شواهد میں کمی کرنے کے ساتھ یا کمی کے بغیر کوئی فن بھی حذف کردیا گیا ہو۔ اگر ایسا ہے تو ممکن ہے «حدایق المعجم» عروض وقافیہ پر مشتمل ہو اور علم بدیع چھوڑ دیا گیا ہو۔ کیونکہ تھانوی کی کشاف میں اس کا ذکر عروض و قافیہ کے سلسلے میں اور باقی کتابوں میں عروض کے سلسلے میں ہے۔ «فرهنگ جہاں گیری» سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ المعجم کا حصۂ عروض، المعجم سے الگ کرکے ایک مستقل رسالہ کی حیثیت سے بھی لوگوں کے ہاتھوں میں رہا ہے چنانچہ اس نے لفظ «خورنگاہ» کی سند میں لکھا ہے «محمد بن قیس در عروض خود نوشتہ» اس سے مطلب یہ ہوا کہ در رسالۂ عروض خود یا در کتاب عروض خود نوشتہ۔ اگر عروض کا حصہ «المعجم» سے دستیاب نہیں ہوتا تھا تو صاحب «فرهنگ جہاں گیری» «در عروض خود» نہ لکھتا بلکہ پوری کتاب المعجم، کا نام لیتا۔ اگر کسی کتاب میں عروض کے ساتھ قافیہ بھی شامل ہو تو اہل فن اسے عروض کی کتاب کہنا کافی سمجھتے ہیں اور قافیہ کا ذکر اس میں مضمر مانتے ہیں چنانچہ طوسی کی «معیار الاشعار»

اگرچہ عروض وقافیہ دونوں پر مشتمل ہے مگر اکثر قدیم کتابوں میں صرف عروض کے نام سے یاد کی جاتی تھی عروض و قافیہ کے علاوہ مباحث بدیع وغیرہ بھی کسی کتاب میں شامل ہوں تو اس کتاب کو صرف عروض کی کتاب یا رسالہ کہنے کی رسم نہیں ہے۔ «المعجم» ایسی ہی کتاب ہے۔ اگر صاحب «فرہنگ جہانگیری» کی مراد المعجم سے ہوتی تو وہ عروض کی کتاب نہیں کہتا ایسی کتاب کو صرف عروض کہنے کا ایک موقع ہے۔ وہ جب ہے کہ عروضی مبحث کے سلسلے میں کتاب کا ذکر کرنا مقصود ہو۔ «خور نگاہ» کی بحث میں یہ صورت بھی نہیں ہے۔ «المعجم» کا اختصار ہونے کی صورت میں خواہ وہ تینوں فنون پر مشتمل ہو خواہ چند فنون پر «حدایق المعجم» کے نام کے متعلق یہ سمجھنا چاہیے کہ جس شخص نے اسے مختصر کیا اس نے اس اختصار کو اپنی ذاتی کاوش سمجھکر اور اس فرق کی بنا پر جو مختصر ہونے کی وجہ سے اس میں اور المعجم میں پیدا ہوگیا۔ اس کا نام اپنے طور پر المعجم سے مختلف «حدائق المعجم» رکھ دیا۔ جیسے المعجم کے اختصار «میزان الاوزان» کا نام المعجم سے مختلف ہے۔ چونکہ اس مختصر نسخہ میں یہ ذکر ہوگا کہ یہ شمس قیس کی تصنیف کا اختصار ہے۔ نیز یہ بھی ممکن ہے کہ مختصر کرنے والے کا نام اس پر کسی وجہ سے موجود نہ ہو اس لیے اصل کتاب کے مصنف کا خیال کرکے مصنفین نے اس کا ذکر محمد بن قیس کی تصنیف کی حیثیت سے کیا اور مختصر کرنے والے کا نام اس کے ساتھ نہیں لیا۔ «حدائق المعجم» کو المعجم کا اختصار ماننے کی صورت میں یہ بات تسلیم کرنے کے قابل نہیں ہے کہ محمد بن قیس نے خود اسے المعجم سے مختصر کیا ہو۔ کتاب الکافی سے مختصر کرکے المعجم تالیف کرنے کی وجہ تو اس کے لیے تھی لیکن المعجم کو مزید مختصر کرنے کی اس کے لیے کیا وجہ ہوسکتی تھی۔ پھر اس کی کوئی سند بھی نہیں ہے کہ اس نے المعجم کو مختصر کیا۔

میری رائے میں «حدائق المعجم» کے متعلق اس کے المعجم کا اختصار ہونے کے علاوہ اور صورتیں بھی ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ وہ المعجم ہی ہو

اور «معیار المعجم» کی طرح غلط طور پر «حدائق المعجم» نام پڑ گیا۔ آگے چلکر یہ غلط نام نقل در نقل متعدد کتابوں میں گھر کر گیا۔ دوسری صورت یہ کہ «حدائق المعجم» کی دوسرے مصنف کے قلم سے المعجم کی شرح ہو۔ اس کتاب کا خیال کرکے نیز اس سبب سے کہ شارح کا نام معلوم نہ ہوسکا اس کو محمد بن قیس سے منسوب کردیا گیا جب تک «حدائق المعجم» کا کوئی نسخہ دستیاب نہ ہو اور اس کا مقابلہ المعجم سے نہ کیا جائے۔ ان تینوں خیالوں میں سے کسی ایک خیال کو بالکل صحیح اور باقی خیالات کو بالکل غلط نہیں کہا جاسکتا۔ «فرہنگ جہانگیری» سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مصنف نے فارسی کا ایک لغت بھی لکھا تھا چنانچہ «فرہنگ جہانگیری» کے دیباچہ میں اس کے مؤلف نے اپنے مآخذ میں «فرہنگ محمد بن قیس» کا بھی نام لیا ہے۔ مصنف کا یہ لغت اب ناپید ہے۔

امیر خسرو دہلوی :

ہندوستان کے مشہور فارسی گو شاعر جن کے کمال شاعری اور اُستادی کے ایرانی بھی معترف ہیں۔ موسیقی کے بھی ماہر تھے۔ شاعری میں کثیر التصانیف ہیں۔ امیر خسرو نے اعجاز خسروی ۳ جلدوں میں لکھی۔ یہ ۷۱۹ ھ میں تمام ہوئی اس کتاب میں علم بدیع پر بہت زور طبع صرف کیا ہے۔ سینکڑوں صنعتیں اپنی طرف سے ایجاد کی ہیں۔ نہایت ضخیم کتاب ہے۔ اس میں فن کی سنجیدگی کم ہے، تفنن طبع اور فضول باتیں بہت ہیں۔ پروفیسر اصغر علی روحی صاحب «دبیر عجم» نے اس پر بجا طور پر یہ تنقید کی ہے « حضرت امیر خسرو دہلوی در فن سیاقت و بدیع بر طبق مذاق ابناء آں روزگار کتابے موسوم بہ اعجاز خسروی تالیف نمودند و آن کتاب ست کہ باہمہ اطناب و اطالت نظر بہ ضرورت فن بلاغت ہیچ با خود ندارد»۔

عاشق صادق :

یہ ایک مجہول الحال ہندوستانی مصنف ہے۔ امیر خسرو کا معاصر تھا۔ اس کی تصنیف کا نام «جامع الصنائع» ہے جو عروض اور بدیع دونوں پر مشتمل ہے۔ «حدایق البلاغت» نے اس کا ذکر کیا ہے۔ اس کے الفاظ

یہ ہیں۔ «یکے از معاصران امیر خسرو دهلوی که عاشق صادق نام داشت رساله عروض و صنائع تالیف نمود و آں را جامع الصنائع نام کرده و در آنجا سه بحر دیگر اختراع نموده و باعتقاد خود دو رکن تازه پیدا ساخته»۔ اس کے متصلاً بعد اور ایک سطر اس پر اور صرف کی ہے۔ جس میں اس کی اس عروضی ایجاد کا تحصیل حاصل ہونا ظاہر کیا ہے۔ اس کے سوا اور کسی کتاب میں اس مصنف یا اسکی تصنیف کا ذکر نہیں ملا۔

اس کی اس عروضی ایجاد سے قیاس ہوتا ہے کہ اس نے علم بدیع میں بھی اسی طرح کچھ نئے گل کھلائے ہوں گے۔ لفظ صادق معلوم نہیں اس مصنف کے نام کا جزو ہے یا صاحب «حدائق البلاغت» نے عاشق کی رعایت سے مزاحاً اضافه کردیا۔ ممکن ہے اس رعایت سے خود مصنف نے یہ لفظ بطور تخلص اختیار کیا ہو۔

حسن:

اس مصنف کا نام اور تخلص دونوں حسن ہے اس نے علم بدیع پر ایک کتاب «بحر الصنائع» لکھی۔ یہ کتاب منظوم ہے ۷۳۱ ھ میں تصنیف ہوئی۔ اس میں صنعتوں کی تعریف اور مثالیں دونوں نظم میں ہیں۔ مصنف نے مثال میں اکثر شاعروں یہاں تک کہ سعدی اور سلمان ساوجی کے اشعار بھی نقل کیے ہیں جو اس کی تصنیف کے وقت ۲۲ سال سے زیادہ کے نہ تھے۔

اس کتاب کی نظم سست اور اکثر بےمزہ اور رکیک ہے۔ اس کی ابتدا میں مصنف نے اپنی نسبت بڑے بڑے دعوے کیے ہیں۔ اس نے لکھا ہے کہ اس کتاب کی تصنیف کے لیے اس نے بہت سی کتابوں کا مطالعه کیا۔ وہ اس کا بھی مدعی ہے کہ اس نے اس میں جدت طبع سے کام لیا ہے۔ رشید وطواط اور اس کی کتاب «حدائق السحر» کا ذکر کر کے وطواط پر اپنی فضیلت علمی ظاہر کی ہے۔ چنانچہ لکھتا ہے:

شبی در خلوتی بودم مفکر　زبان فکر در معنی مذکر
نگه کردم بانواع تألیف　نظر کردم باصناف تصانیف
همی چیدم گل از باغ قدیمان　همی جستم نواء عندلیبان

در آں حالت زبستان رشیدی — شنیدم بانگ مرغ من یریدی
که در عالم حدائق سحر باشد — چو شعری بر عروساں پر باشد
نهادم دست دل را بر حدائق — نظر بردم بداں باغ دقائق
بهر شاخی هزاراں دست دیدم — ز هر مرغی هزار آوا شنیدم

در آں ساعت حرد گفتا حسن خیز — براق خود در ایں میداں بر انگیز
مخواه از هیچ خانه شربت آب — منوش از کاسهٔ کس بادهٔ ناب
بساز از ذهن خود چیزی درآں فن — که بادت آفریں بر ذهن روشن
حدودش را بطور مثنوی آر — همه الفاظ نغز و معنوی آر
غزلها گونه امثالش سراسر — که باتو می نباشد کس برابر
اگرچه بد دریں فن چست و طواط — چنانک اندر علوم نبض بقراط
ولی وطواط مرغی بس حقیرست — بچنگ همچو تو بازی اسیرست
مگو کیں دعوی من بس عظیم ست — که فوق کل ذی علم علیم ست
بنه نام خوشش سحرالصنائع — ادیباں را بده گنج بدائع

شرف الدین حسن بن محمد رامی تبریزی:

علم بدیع پر اس مصنف کی تصنیف کا نام «حدائق الحدائق» ہے۔ یہ مصنف بہادر خاں امیر شیخ اویس ایلکانی (٧٥٧ - ٧٧٦ ھ) کا ملازم تھا۔ اسی کے حکم سے یہ کتاب لکھی۔ یہ کتاب رشید وطواط کی «حدائق السحر» کی شرح ہے۔ اس مصنف نے مثال میں وہ فارسی اشعار استعمال کیے ہیں جو اس زمانہ میں متداول تھے۔

تاج الحلاوی:

اس مصنف کا نام علی بن محمد ہے۔ تاج الحلاوی کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا شمار آٹھویں صدی ہجری کے شعرا میں ہے۔ علم بدیع پر اس کی کتاب کا نام «دقائق الشعر» ہے۔ اس میں علم بدیع کے علاوہ چند فصلیں اصناف شعر، عیوب قوافی اور عیوب ردیف پر بھی ہیں۔ اس نے کتاب کے مقدمہ میں «حدائق السحر» کا ذکر کیا ہے۔ مثال میں اکثر اشعار «حدائق السحر» سے مختلف پیش کیے ہیں۔

[ ١٩٦٤/٤/٢ م ]

***

# قاسم بن قطلوبُغا الحنفی

فضل الرحمن*

**تصانیف :**

قاسم کی تصنیفی زندگی کی ابتدا اٹھارہ سال کی عمر سے ہوئی. سب سے پہلی کتاب جو ۸۲۰ ھ میں ان کے قلم سے نکلی فرائض کے فن پر تھی اور اس کا نام « جامعة الأصول فی الفرائض » تھا. ۵۹ سال کے طویل عرصے میں اپنی عمر کے آخر حصے تک قاسم نے بہت کچھ لکھا. انہوں نے اپنے دور کے مروجہ علوم وفنون میں سے ہر ایک پر لکھا ہے اور ان کے تصنیفی اور تالیفی کام میں اس زمانے کی علمی دنیا کے سارے رجحانات مل جاتے ہیں. ان کے یہاں شروح، حواشی، تخریجات، ترتیب و تبویب، تلخیصات، اور منفرد مسائل پر مستقل تصانیف، غرض سبھی کچھ ملتا ہے. چھوٹی بڑی سب کتابیں شمار کی جائیں تو تعداد سو سے اوپر نکلتی ہے. تصانیف کی اس کثرت کے باوجود ان کی طباعت کی طرف توجہ کم کی گئی. صرف تین کتابیں ایسی ہیں جو اب تک طبع ہوئی ہیں. « تاج التراجم فی من صنف من الحنفیة » لیپزگ میں ۱۸۶۲ء[1] میں، « منیة الألمعی فی ما فات من تخریج الهدایة للزیلعی » مصر میں ۱۳۶۹ ھ میں، اور « رد القول الخائب فی القضاء علی الغائب » ہندستان میں، طبع ہوئیں. آخرالذکر رسالہ مختلف رسائل کے ایک مجموعے «مجموعة الرسائل» (ص ۲۵ تا ص ۲۸) مطبع حیدری بمبئی میں چھپا ہے، سال طباعت مندرج نہیں ہے. جن نسخوں سے اس کی تصحیح وغیرہ میں مدد لی گئی ہے اُن کا بھی ذکر

(*) فضل الرحمن، لیکچرر شعبۂ دینیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۱) یہ کتاب ابھی حال میں دوبارہ شائع ہوئی ہے.

نہیں ملتا تاہم صحت متن کا خاصا خیال رکھا گیا ہے۔ عام طور سے لوگ قاسم سے ان کی مشہور تصنیف «تاج التراجم» سے واقف ہیں جو سوانح کے معتبر مآخذ میں شمار کی جاتی ہے۔ قاسم کی بقیہ تصانیف اگرچہ طباعت سے محروم رہیں لیکن انہیں ہمیشہ اہمیت دی گئی فقہ کی معتبر کتابوں میں قاسم کی تصانیف کے حوالے بطور سند کے پیش کیے جاتے ہیں۔ «در مختار»[1] اور اس کی شرح «رد المحتار»[2] میں جو فقہ حنفی کے معتبر اور مستند ترین ماخذوں میں سے ہیں جا بجا قاسم کی تحقیقات کا حوالہ دیا گیا ہے۔ ابن عابدین شامی مؤلف «ردالمحتار» نے دیباچے میں اُن کتابوں اور مصنفوں کا ذکر کرتے ہوئے جن پر تحقیق مسائل میں بھروسا کیا ہے لکھا ہے «معتمداً فی ذلک علی ماحرّره الأئمة الأعلام من المتأخرين العظام كالإمام ابن الهمام و تلميذيه العلامة قاسم و ابن امير حاج»[3] جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ متأخرین علمائے حنفیہ میں قاسم کی حیثیت فقہ کے ایک بڑے امام کی ہے۔ ذیل میں فن وار تفصیلی فہرست قاسم کی تصانیف کی پیش کی جاتی ہے[4]:

عربی زبان و ادب:

۱۔تعليقة على القصارى فى الصرف[5]: علم صرف میں علاء الدین احمد الخجندی البرہانی کا تصنیف کیا ہوا متن «القصاری» کے نام سے مشہور ہے، اس پر قاسم نے تعلیقات لکھی ہیں۔

۲۔حاشية على شرح العزى فى الصرف للتفتازانى[6]: عزالدین ابوالفضائل

---

(۱) مثلاً دیکھیے در مختار (طبع علی حاشیۃ رد المحتار) ۱:۵۳، ۱۳۲ وغیرہ۔

(۲) ردالمحتار ۱ : ۵۱ ۔

(۳) ایضاً ۱ : ۳۔

(٤) کتابوں کے ناموں کے مآخذ کی تصریح حواشی میں کردی گئی ہے تفصیلات ہماری فراہم کی ہوئی ہیں۔

(٥) الضوء اللامع ٦ : ۱۸۷ ۔

(٦) الضوء ٦ : ۱۸۷؛ إسماء المؤلفين ۱ : ۸۳۰؛ کشف الظنون : ۱۱٤۰

ابراهیم بن عبدالوهاب بن عمادالدین بن ابراهیم الزنجانی (م بعد ٦٥٥ ھ) نے ایک مختصر سی کتاب علم صرف میں لکھی جس کا نام «العزی فی الصرف» [یا التصریف] ھے ۔ سعدالدین مسعود بن عمر التفتازانی (م ۷۹۱ ھ) نے اس کی شرح کی اور اصل کتاب پر اپنی طرف سے اضافے بھی کیے جس سے اس کی حیثیت ایک مستقل کتاب کی ھوگئی ۔ یہ تفتازانی کی سب سے پہلی تالیف ھے اور ۷۳۸ ھ مکمل ھوئی ۔ قاسم نے اسی شرح پر حاشیہ لکھا ھے ۔

۳ــتعلیقة علی الأندلسیة فی العروض[1] : ابو محمد عبد اللہ بن محمد الانصاری الاندلسی المعروف بابی الجیش الانصاری المغربی (م ٥٤٩ ھ) کا قصیدہ فن عروض میں «عروض الاندلس» اور «الاندلسیة فی العروض» کے نام سے مشہور ھے اور علل الاعاریض سے خاص طور سے بحث کرتا ھے ۔ قاسم نے اس قصیدے کی شرح کی ھے ۔

٤ــشرح خمسة العز عبدالعزیز الدیرینی فی العربیة[2] .

٥ــاختصار تلخیص المفتاح[3]: «مفتاح العلوم» سکاکی (م ٦٢٦ ھ) کی تالیف ھے ۔ کتاب تین قسموں پر تقسیم کی گئی ھے ۔ قسم اول صرف میں، قسم ثانی نحو میں، قسم ثالث معانی و بیان میں ھے ۔ قسم ثالث کی تلخیص شمس الدین محمد بن عبد الرحمن بن عمر القزوینی معروف بہ خطیب دمشق (م ۷۳۹ ھ) نے «تلخیص المفتاح» کے نام سے کی ۔ قاسم نے اس تلخیص کو مختصر کیا ھے ۔

عقائد :

٦ــحاشیة علی شرح العقائد[4]: تفتازانی کی «شرح عقائد نسفی» پر حاشیہ ھے ۔

۷ــالفاظ الردة[5]: جن اقوال کی بنا پر کسی کو دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیا جائے گا اس رسالے میں ان کا ذکر ھے ۔

---

(۱) الضوء ٦ : ۱۸۷ ؛ اسماء المؤلفین ۱ : ۸۳۰ ؛ کشف : ۱۱۳۵ .

(۲) الضوء ٦ : ۱۸۷

(۳) الضوء ٦ : ۱۸۷

(٤) الضوء ٦ : ۱۸۷

(٥) بروکلمن، تکملہ ۲ : ۹۳

۸ــقواعد فی نظم العقائد[1].

۹ــحاشیة علی المسایرة[2] : ابن ھمام کی «المسایرة فی العقائد المنجیة فی الآخرة» پر حاشیہ ھے۔

۱۰ــمن یکفر و لم یشعر[3] : کفریہ اقوال و افعال کے بارے میں ایک رسالہ۔

منطق وغیرہ :

۱۱ــشرح منار النظر فی المنطق لابن سینا : سخاوی نے اس کتاب کا یوں نام دیا ھے[4] مگر «کشف الظنون» میں «میزان النظر فی المنطق» (مصنف نا معلوم) کے نام کے تحت بتایا ھے کہ قاسم نے اس کی ممزوج شرح لکھی ھے جس کا نام «تقویم المیزان» ھے مگر پھر لکھا ھے کہ یہ غالباً وھی «تقویم اللسان» ھے جس کا ذکر پہلے گزرا[5]۔ یہ عجیب بات ھے کیونکہ «تقویم اللسان» تو فن رجال میں ھے اور یہ کتاب فن منطق میں۔

۱۲ــشرح قصیدة الغزلیة[6]۔

۱۳ــالجواب[7] : بروکلمن نے عنوان اتنا ھی دیا ھے جس کی وجہ سے معلوم نہیں ھوتا کہ کس کا جواب ھے۔

۱٤ــشرح المقتبس[8]۔

علوم القرآن :

۱٥ــتعلیقات علی البیضاوی[9] : تفسیر سے متعلق قاسم کی اسی ایک تالیف

(۱) بروکلمن، تکملہ ۲ : ۹۳

(۲) بروکلمن، تکملہ ۲ : ۹۳ ؛ اسماء المؤلفین ۱ : ۸۳۱

(۳) اسماء المؤلفین ۱ : ۸۳۱ (٤) الضوء ٦ : ۱۸۷

(٥) کشف : ۱۹۱۹۔

(٦) بروکلمن، تکملہ ۲ : ۹۳۔

(۷) بروکلمن ۲ : ۸۱ (۹۹) *[بریکٹ کے اندر کے اعداد بروکلمن کی کتاب کے نئے ایڈیشن کے ھیں]*۔

(۸) بروکلمن ۲ : ۸۱ (۹۹)۔ (۹) کشف : ۱۹۳۔

کا پته چلتا هے . یه کتاب پوری نه هوئی صرف سورۂ بقرہ کے دوسرے رکوع کی آیت «فهم لایرجعون» تک تعلیقات لکھی جاسکیں.

١٦ــغریب القرآن[1] : قرآن مجید کے الفاظ کی تشریح و توضیح.

علوم الحدیث:

١٧ــشرح منظومة فی الحدیث لابن الجوزی[2] : یه ابن جوزی کی نظم کی صرف شرح هی نہیں بلکه قاسم کا کہنا هے که اس شرح میں انہوں نے سارے علوم و فنون پر بحث کی هے . چنانچه اس کی حیثیت ایک مستقل تصنیف اور دائرة المعارف کی سی تھی. قاسم کو اپنی اس کتاب پر بہت ناز تھا اور کہتے تھے «انه زردخانتی» اس سے یه ظاهر کرنا مقصود تھا که اپنا سارا علمی سرمایه اس میں جمع کردیا هے . اس کتاب کی صرف دو جلدیں تیار هوسکیں کتاب مکمل نه هوئی.

١٨ــشرح قصیدة ابن الفرح الاشبیلی فی الاصطلاح[3] : شهاب الدین ابو العباس احمد بن الفرح اللخمی المالکی (م ٦٩٩ ھ) نے اصول حدیث کو ایک نظم کی شکل دے دی تھی تاکه حفظ میں آسانی هو. قاسم نے اس کی شرح کی اور اس میں اپنے استاد عز بن جماعة پر متعدد مقامات پر گرفت کی جس کی وجه یه تھی که وه حنفیه کے اصول حدیث پر سخت اعتراضات کرتے تھے.

١٩ــحاشیة علی شرح ألفية العراقی[4] : مشهور محدث زین الدین عبدالرحیم بن حسین عراقی نے ابن الصلاح (م ٨٠٦ ھ) کی کتاب «علوم الحدیث» کی

---

(١) زرکلی : الأعلام ٦ : ١٥ . الأعلام سے پتا چلتا هے که اس کا قلمی نسخه موجود هے .

(٢) کشف الظنون : ١٨٦٦ اور اسماء المؤلفین (١ : ٨٣١) نے یہی نام دیا هے مگر الضوء اللامع (٦ : ١٨٦) میں اس کا نام «شرح منظومة ابن الجزری» دیا هوا هے . شذرات (٧ : ٣٢٦) میں بھی ابن الجزری هے . اس میں منظومة کا نام «الهدایة» بتایا گیا هے .

(٣) الضوء ٦ : ١٨٦ ؛ کشف : ١٣٢٩ .

(٤) الضوء ٦ : ١٨٦ کشف : ١٥٦ ,

تلخیص کر کے اس کا نام « الألفية فی اصول الحدیث » رکھا. پھر الفیه کی شرح «فتح المغیث» کے نام سے لکھی. قاسم نے اس شرح پر حواشی لکھے ہیں.

۲۰ و ۲۱ — حاشية نخبة الفکر و شرح نخبة[1] : «نخبة الفکر فی مصطلح اهل الأثر» اصول حدیث میں ابن عسقلانی کا مشہور متن ہے. قاسم نے اس متن پر بھی حاشیه لکھا[2] ہے اور شرح پر بھی[3].

۲۲ — تخریج عوارف المعارف[4] : شهاب الدین ابو حفص عمر سهروردی (م ۶۳۲ ھ) سلسلۂ سهروردیه کے بانی اور محققین صوفیه میں سے ہیں. ان کی کتاب «عوارف المعارف» علم طور سے مشائخ صوفیه میں متداول و مقبول ہے. اس میں جو احادیث آتی ہیں قاسم نے ان کی تخریج کی ہے.

۲۳ — تخریج احادیث الإختیار شرح المختار[5] : ابو الفضل مجد الدین عبد الله بن محمود بن مودود الموصلی الحنفی (م ۶۸۳ھ) نے « المختار فی فروع الحنفية » کے نام سے امام ابوحنیفه کے اقوال اور حنفی مذهب کے مستند مسائل جو امام ابوحنیفه کے شاگردوں سے منقول ہیں جمع کیے. خود اس کی شرح بھی لکھی جس کا نام « الإختیار » ہے. شرح میں علل المسائل، معانی اور فروع کا ذکر بھی کیا. «المختار» کا شمار ان متون اربعه (المختار، الکنز، الوقاية، مجمع البحرین). میں ہے جن پر متاخرین حنفیه اعتماد کرتے ہیں. قاسم نے « الإختیار» کی احادیث کی تخریج کی ہے. یه کتاب دو جلدوں میں مرتب ہوئی.

۲۴ — تخریج احادیث بزدوی فی اصول الفقه[6]: فخر الاسلام علی بن محمد

---

(۱) الضوء ۶ : ۱۸۶.   (۲) کشف : ۱۹۳۷.

(۳) اسماء المؤلفین (۱ : ۸۳۰) سے اس کا نام «تعلیقة علی شرح نخبة الفکر لتقی الدین الشمنی» معلوم ہوتا ہے.

(۴) *الضوء ۶ : ۱۸۶*.

(۵) کشف : ۱۶۲۳؛ الضوء ۶ : ۱۸۶؛ شذرات الذهب ۷ : ۳۲۶.

(۶) کشف : ۱۱۳ ؛ *الضوء* ۶ : ۱۸۶ ؛ *اسماء المؤلفین* (۱ : ۸۳۱): « تخریج الأحادیث من اصول البزدوی » ؛ شذرات ۷ : ۳۲۶

ابزدوی م ٤٨٢ ھ اکابر حنفیہ میں سے ہیں۔ ان کی «اصول الفقہ» حنفی اصول فقہ کی بنیادی کتابوں میں سے ہے۔ قاسم نے اس کی احادیث کی تخریج کی۔ یہ مختصر سی کتاب تھی۔

٢٥—تخریج احادیث تفسیر ابی اللیث[1]: ابو اللیث نصر بن محمد الفقیہ السمرقندی الحنفی (م ٣٨٥ ھ) مشہور و معروف حنفی فقیہ کی تصانیف فقہ کے علاوہ دیگر فنون میں بھی ہیں۔ قاسم نے ان کی تفسیر کی احادیث کی تخریج کی۔

٢٦ تا ٢٩—تخریج احادیث الأربعین فی اصول الدین؛ و منہاج الاربعین؛ و جواہر القرآن؛ و بدایۃ الہدایۃ[2]: یہ چاروں کتابیں امام غزالی کی ہیں۔ ان کی احادیث کی تخریج قاسم نے کی ہے۔

٣٠—تخریج الأحیاء بما فات من تخریج احادیث الإحیاء[3]: امام غزالی کی «إحیاء العلوم» کی احادیث کی تحریج عراقی نے «المغنی عن حمل الاسفار» کے نام سے کی تھی۔ جن احادیث کی تخریج عراقی سے چھوٹ گئی ان کی قاسم نے کردی۔

٣١—تخریج احادیث الشفاء[4]: ابو الفضل عیاض بن موسی القاضی الیحصبی (م ٥٤٤ ھ) نے «الشفاء بتعریف حقوق المصطفی» کے نام سے سیرت کی مشہور کتاب لکھی ہے۔ قاسم نے اس کی احادیث کی تخریج شروع کی تھی مگر کتاب نامکمل رہی اور کام چند اوراق سے آگے نہ بڑھ سکا۔

٣٢— منیۃ الألمعی بما فات الزیلعی[5]: حنفی محدث ابو محمد جمال الدین

---

(١) الضوء ٦ : ١٨٦؛ کشف : ٤٤١

(٢) الضوء ٦ : ١٨٦

(٣) الضوء ٦ : ١٨٦؛ کشف : ٢٤ میں اس کا نام «تحفۃ الأحیاء» دیا ہے اور اسماء المؤلفین میں ایک جگہ «اتحاف الأحیاء» بتایا ہے اور دوسری جگہ «تحفۃ الأحیاء» (١ : ٨٣٠).

(٤) الضوء ٦ : ١٨٦

(٥) الضوء ٦ : ١٨٦

عبداللہ بن یوسف بن محمد الزیلعی (م ۷۶۲ ھ) نے «ہدایہ» کی احادیث کی تخریج «نصب الرایۃ فی احادیث الھدایۃ» کے نام سے کی ۔ قاسم نے اپنی کتاب میں ان احادیث کی تخریج کی جو زیلعی سے رہ گئی تھیں یہ کتاب مصر میں «منیۃ الألمعی فی ما فات من تخریج احادیث الھدایۃ للزیلعی[1]» کے نام سے ۱۳۶۹ ھ میں چھپ گئی ۔ قاسم نے اس کے دیباچے میں ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے غفلت کے نتیجے میں حنفی علماء اور خاص کر صاحب ہدایہ پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ غریب احادیث سے استدلال کرتے ہیں ۔ قاسم نے بتایا کہ متقدمین فقہائے حنفیہ احادیث کا املا اپنی اسانید سے کراتے تھے ۔ امام ابو یوسف ، محمد ، طحاوی ، خصاف ، ابو بکر رازی اور کرخی وغیرہ سب نے یہی کیا ہے ۔ بعد کے حنفی فقہا نے ان حضرات پر اعتماد کی بنا پر ان احادیث کو بغیر سند اور حوالے کے اپنی کتابوں میں درج کیا جیسے صحاح ستہ پر اعتماد کرکے ان کی احادیث بلا سند اور اکثر بلا حوالے درج کی جاتی رہی ہیں ۔ جن لوگوں کو مذکورہ احادیث کی اسناد کا علم نہ تھا انہوں نے ان حنفی فقہاء پر مذکورہ الزام لگا دیا ۔ قاسم کے خیال کی تائید امام محمد کی «کتاب الآثار» کے مطالعے سے بھی ہوتی ہے ۔

۳۳—بغیۃ الرائد فی تخریج احادیث شرح العقائد[2] : نجم الدین ابو حفص عمر بن محمد النسفی (م ۵۳۷ ھ) نے «العقائد» کے نام سے اصول دین کا ایک مختصر متن تیار کیا تھا ۔ اس کی مشہور ترین شرح سعد الدین مسعود بن عمر التفتازانی (م ۷۹۱ ھ) نے لکھی جو «شرح عقائد نسفی» کے نام سے متداول ہے ۔ قاسم نے اسی شرح کی احادیث کی تخریج کی ہے ۔

۳۴—نزھۃ الرائض فی ادلۃ الفرائض[3] : سراج الدین محمد بن محمود بن عبدالرشید

---

(۱) کشف : ۱۷۸۵ اور اسماء المؤلفین ۱ : ۸۳۱ میں یہی نام دیا گیا ہے ۔

(۲) الضوء ۶ : ۱۸۶ ؛ اسماء المؤلفین ۱ : ۸۳۰ میں نام «بغیۃ الراشد» ہے

(۳) الضوء ۶ : ۱۸۶ ؛ اسماء المؤلفین ۱ : ۸۳۰ شذرات ۷ : ۳۲۶ کشف : ۱۲۵۰ : «تخریج احادیث الفرائض» ۔

السجاوندی الحنفی کی کتاب فرائض میں «السراجیة» کے نام سے مقبول درسی کتاب ہے قاسم نے «نزهة الرائض» کے نام سے اس کی احادیث کی تخریج کی۔

۳۵—ترتیب مسند ابی حنیفة لابن المقری[1] : ابوبکر محمد بن ابراهیم بن علی الخازن مشہور بہ ابن المقری الاصفہانی (م ۳۸۱ ھ) اکابر حفاظ حدیث میں سے ہیں۔ ذہبی «تذکرة الحفاظ» میں انہیں «ابن المقری محدث اصبہان الامام الرحال الحافظ الثقة» اور ابونعیم اصفہانی نے «محدث کبیر صاحب مسانید، «سمع ما لا یحصی کثرة» کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ انہوں نے امام ابوحنیفہ کی حدیثی روایات کو جمع کیا اور اس کا نام «مسند ابی حنیفة» رکھا۔ ابن حجر نے بتایا ہے کہ یہ مسند صرف امام ابوحنیفہ کی مرفوع روایات پر مشتمل ہے۔ قاسم نے اس کی احادیث کو فقہی ابواب پر مرتب کیا ہے۔

۳۶—ترتیب مسند ابی حنیفة للحارثی[2] : ابو محمد عبداللہ بن محمد بن یعقوب بن الحارث الحارثی البخاری (م ۳۴۰ ھ) مشاہیر ائمۂ احناف میں سے ہیں۔ شاہ ولی اللہ نے «الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ» میں ان کو اصحاب الوجوہ میں سے بتایا ہے جن کا درجہ مجتہد فی المذہب اور مجتہد مطلق منتسب کے درمیان ہے۔ دو واسطے سے امام محمد کے شاگرد ہیں۔ فن حدیث میں ان کا پایہ اس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ ان کے بارے میں حافظ خلیلی نے «یعرف بالاستاذ له معرفة بهذا الشأن» سمعانی نے «کان شیخاً مکثراً من الحدیث» اور ذہبی نے «تذکرة الحفاظ» میں «عالم ماوراء النہر و محدثه الامام العلامة . . . الملقب بالاستاذ» کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ابن حجر نے «تعجیل المنفعة» میں انہیں حفاظ حدیث میں شمار کیا ہے۔ انہوں نے بھی امام ابو حنیفہ کی مسند تیار کی، جو ابن المقری کی مسند سے بڑی تھی۔ قاسم نے اس مسند کی احادیث کو فقہی ابواب پر مبوب ومرتب کیا۔

---

(۱) الضوء ٦ : ۱۸٦.

(۲) الضوء ٦ : ۱۸٦؛ کشف : ۱٦۸۰.

۳۷۔۔امالی علی مسند ابی حنیفة[1] : حارثی کی مسند پر قاسم نے دو جلدوں میں اپنے لکھے مسودے قلم کرائے تھے۔

۳۸۔۔امالی علی مسند عقبة بن العامر الجهنی نزیل مصر[2] : حضرت عقبة بن عامر الجہنی مشہور صحابی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کثیر تعداد میں حدیثیں روایت کیں۔ صحابہ اور تابعین دونوں نے ان سے روایت کی ہے۔ اہل مصر نے بھی ان سے بکثرت روایت کی۔ قاری، فقہ و فرائض کے عالم، شاعر اور کاتب تھے۔ آپ نے قرآن بھی جمع کیا تھا اور آپ کا مصحف حضرت عثمان کے مصحف کی ترتیب سے مختلف تھا۔ اس مصحف کے اخیر میں آپ نے اپنے دستخط بھی ثبت فرمائے تھے۔ مصر کے گورنر رہے اور حضرت معاویہ کے عہد حکومت کے شروع میں ۵۸ ھ میں وفات پائی[3]۔ ان کی سب روایتوں کو جمع کرکے مسند ترتیب دے دی گئی تھی۔ اس مسند پر قاسم نے امالی لکھے۔

۳۹۔۔عوالی احادیث لیث[4]: لیث بن سعد بن عبد الرحمن الفهمی (م ۱۷۵ھ) مصر کے مشہور فقیہ اور امام مالک کے معاصر ہیں۔ ان کی احادیث کی عالی سندیں قاسم نے جمع کیں۔

۴۰۔۔عوالی احادیث طحاوی[5]: امام طحاوی (م ۳۲۱ ھ) اکابر حنفیہ میں سے ہیں۔ حدیث و آثار کے زبردست عالم اور فقه الحدیث کے ماہر ہیں۔ ان کی احادیث کی بھی عالی سندیں قاسم نے جمع کیں۔

۴۱۔۔تعلیق مسند الفردوس[6]: ابو شجاع شیرویه بن شهردار ابن شیرویه

---

(۱) الضوء ۶ : ۱۸۶؛ کشف : ۱۶۸۰۔

(۲) الضوء ۶ : ۱۸۶؛ بروکلمن نے اس کتاب کا نام «مسند سیدی عقبة بن عامر الجهنی» دیا ہے (۲ : ۸۱) جس سے خیال ہوتا ہے قاسم نے خود ہی یہ مسند مرتب کیا ہے۔

(۳) ابن حجر : الإصابة ۲ : ۱۱۶۴۔

(۴) الضوء ۶ : ۱۸۶؛ کشف : ۱۱۷۸؛ بروکلمن ۲ : ۸۱ (۹۹)۔

(۵) الضوء ۶ : ۱۸۶؛ بروکلمن ۲ : ۸۱ (۹۹) (۶) الضوء ۶ : ۱۸۶۔

بن فنا خسرو الهمدانی الدیلمی (م ۵۰۹ ھ) نے «فردوس الأخبار بمأثور الخطاب المخرج علی کتاب الشہاب» کے نام سے دس ہزار احادیث پر مشتمل ایک کتاب مرتب کی۔ اس میں صرف رواۃ کے نام دے کر اسناد کے باقی حصے کو چھوڑ دیا اور ترتیب حروف تہجی کے مطابق رکھی۔ ان کے بیٹے حافظ شہردار (م ۵۵۸ ھ) نے «فردوس» کی اسانید چار جلدوں میں جمع کیں اور کتاب کا اختصار بھی کردیا نام «مسند الفردوس» رکھا۔ قاسم نے اس پر تعلیقات لکھی ہیں اور تھوڑے سے حصے کی تخریج بھی کی ہے۔

۴۲—الاجوبة عن اعتراضات ابن ابی شیبة علیٰ ابی حنیفة[1]: ابو بکر عبداللہ بن محمد بن ابی شیبة ابراهیم بن عثمان العبسی مولاہم الکوفی (م ۲۳۵ ھ) نامور محدث ہیں۔ بخاری، مسلم، ابوداؤد اور ابن ماجہ کے استاد ہیں۔ ان کی تصانیف میں «مسند» اور «مصنف» زیادہ مشہور ہیں۔ «مصنف» واقعتاً ایک قابل فخر کارنامہ ہے۔ ابن حزم نے اس کو «مؤطا مالک» پر فوقیت دی ہے۔ «مصنف» میں صرف احادیث احکام ہیں مگر ابن ابی شیبہ نے اس میں اہل حجاز و عراق کی ساری روایات جمع کردی ہیں۔ چنانچہ احادیث احکام پر متقدمین کی تصانیف میں یہ جامع ترین کتاب ہے۔ احادیث نبوی کے ساتھ صحابہ و تابعین کے اقوال اور فتاویٰ بھی اس میں جمع کردیے ہیں۔ ابن ابی شیبہ نے اس کتاب میں ایک مستقل باب امام ابو حنیفہ کے رد میں «هذا ما خالف به ابو حنیفة الاثر الذی جاء عن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم» کے عنوان سے دے کر ایک سو پچیس مسائل کی بابت دعویٰ کیا ہے کہ امام ابو حنیفہ کے اقوال ان کے بارے میں مروی صحیح احادیث و آثار کے مخالف ہیں۔ حنفیہ میں سے ابن ابی شیبہ کے اعتراضات کا باقاعدہ جواب سب سے پہلے حافظ عبدالقادر قرشی (م ۷۷۵ ھ) صاحب «الجواهر المضیئة» نے

---

(۱) الضوء ۶ : ۱۸۷، کشف : ۱۲ ؛ اسماء المؤلفین ۱ : ۸۳۰ ؛ ذیل تذکرہ الحفاظ : ۱۵۸ ت، میں اس کا نام «الاجوبة المنیفة عن اعتراضات ابن ابی شیبة علی ابی حنیفة» دیا ہوا ہے۔

«الدرر المنیفة فی الرد علی ان ابی شیبة فیما اورده علی ابی حنیفة» کے نام سے لکھا۔ ابن ابی شیبہ کے ان اعتراضات کا دوسرا جواب قاسم نے لکھا[1]۔

۴۳—تبصرة الناقد فی کید الحاسد فی الدفع عن ابی حنیفة[2]: امام ابوحنیفہ پر جو اعتراضات احادیث و روایات کی مخالفت کے بارے میں کیے جاتے ھیں ان پر تنقید کی گئی ھے۔

٤٤—ترصیع الجوهر النقی[3]: امام بیہقی مشہور محدث ھیں اور شافعی مسلک کے بہت بڑے حامی اور وکیل۔ اپنی «سنن» میں جابجا حنفیہ کے مذھب کو کمزور ثابت کرنے کی کوشش کی ھے۔ علامہ علاء الدین علی بن عثمان مشہور بہ ابن الماردینی الترکمانی (م ۷٤۹ ھ) نے اپنی کتاب «الجوهر النقی» میں بیہقی کی «سنن» پر تنقید کی ھے اور علل احادیث کو واضح کیا ھے۔ قاسم نے ترکمانی کی کتاب کی تلخیص کی اور حروف تہجی کے مطابق اسے ترتیب دیا۔ یہ کام پورا نہ ھوسکا صرف تیمم کے باب تک ھو پایا۔

٤٥—شرح المصابیح للبغوی[4]: محی السنة حسین بن مسعود الفراء البغوی (م ٥١٦ ھ) کی کتاب «المصابیح» (جس کی بنیاد پر مشہور کتاب «مشکوة المصابیح» تیار ھوئی) کی شرح قاسم نے بھی کی۔

٤٦—ترتیب اسئلة الحاکم للدار قطنی[5]: قاسم نے علی بن عمر دار قطنی (م۳۸٥ ھ) کی تصانیف کو مرتب کیا ھے۔

---

(۱) ان اعتراضات کا تیسرا جواب علامہ زاهد الکوثری (م۱۳۷۱ ھ) نے «النکت الطریفة فی التحدث عن ردود ابن ابی شیبة علی ابی حنیفة» کے نام سے لکھا۔

(۲) الضوء ٦ : ۱۸۷ ؛ کشف : ۳۳۸ اور اسماء المؤلفین ۱ : ۸۳۰ میں اس کا نام صرف «تبصرة الناقد فی کید الحاسد» دیا ھے۔

(۳) الضوء ٦ : ۱۸۷؛ کشف : ۱۰۰۷ میں اس کا نام «ترجیع الجوهر النقی» اور اسماء المؤلفین ۱ : ۸۳۰ میں «ترصیع الجوهر النقی فی تلخیص سنن البیہقی» دیا ھوا ھے۔

(٤) الضوء ٦ : ۱۸۷ ؛ کشف : ۱٦۹۸ ؛ اسماء المؤلفین ۱ : ۸۳۱ ۔

(٥) کشف : ۹۱ ؛ الضوء ٦ : ۱۸۷ ۔

٤٧—تخریج احادیث شرح القدوری[1]: احمد بن محمد المعروف بابی نصر الاقطع (م٤٧٤ھ) کی شرح قدوری میں پیش کردہ احادیث کی تخریج ہے۔

٤٨—حاشیة علی مشارق الأنوار[2]: «مشارق الأنوار» مشہور محدث اور لغوی حسن صغانی (م ٦٥٠ھ) کی تالیف ہے جس میں صرف صحیح حدیثیں جمع کی گئی ہیں۔ قاسم نے اس پر حاشیہ لکھا۔

٤٩—مختصر المنتقی لابی محمد عبداللہ بن علی الجارود النیسابوری (م ٣٠٧ھ)[3]: ابن جارود صحیح ابن خزیمہ پر مستخرج ہے اور کیونکہ اس میں صرف احادیث احکام لی گئی ہیں اس لیے اس کا نام «المنتقی» رکھا گیا۔ قاسم نے اس کا اختصار کیا ہے۔

٥٠—ترتیب التمییز للجوز قانی[4]: «التمییز» ضعیف و موضوع حدیثوں سے بحث کرتی ہے۔ قاسم نے اسے مرتب کردیا ہے۔

٥١—مختصر الأربعین لابی سعید احمد بن محمد المالینی (م ٤٠٩ھ)[5]: المالینی کی روایت کردہ چالیس حدیثوں کا مختصر مجموعہ۔

---

(١) شذرات ٧ : ٣٢٦، کشف : ١٦٣٤ سے معلوم ہے کہ غریب احادیث کی شرح ہے

(٢) اسماء المؤلفین ١ : ٨٣٠؛ کشف : ١٦٩٠۔

(٣) بروکلمن ٢ : ٨١ (٩٩)، تکملہ ٢ : ٩٣۔

(٤) الضوء ٦ : ١٨٦ میں مصنف کا نام «الجوزقانی» دیا ہوا ہے۔ مگر صحیح نام غالباً احمد بن اسحاق الجوزجانی ہے جو ایک واسطے سے امام محمد کے شاگرد ہیں اور جن کی ایک کتاب «الفرق و التمییز» ہے (الفوائد البهية : ١٤)۔ کیونکہ الجوزقانی (اللآلی المصنوعة، معجم البلدان، اسماء المؤلفین : الجوزقانی؛ الأعلام : الجورقانی؛ الرسالة المستطرفة : الجوزقی) کا نام ابو عبداللہ الحسین بن ابراهيم بن جعفر ہے ان کی کوئی تصنیف «التمییز» کے نام سے نہیں ہے۔ موضوعات پر جوزقانی کی جو کتاب ہے اس کا نام مذکورہ مآخذ میں «کتاب الموضوعات من الاحادیث المرفوعات» بتایا گیا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب «کتاب الاباطیل» کے نام سے بھی مشہور تھی۔

(٥) بروکلمن ٢ : ٨١ (٩٩)۔

۵۲ـــمختصر مرویات ذی النون[1]: مشهور صوفی ذوالنون مصری کی روایات کا مختصر مجموعہ ۔

رجال، سیر و تراجم :

۵۳ـــرجال طحاوی[2] : طحاوی کی کتاب «شرح معانی الآثار» فقہ الحدیث کے موضوع اور آثار صحابہ کے مجموعے کی حیثیت سے اہم کتابوں میں سے ہے ۔ قاسم نے اس کے رواۃ کے حالات جمع کیے ہیں ۔

۵٤ـــرجال مؤطا محمد[3] : امام محمد کی مؤطا کے راویوں کے حالات ۔

۵۵ـــرجال آثار محمد[4] : امام محمد کی «کتاب الآثار» ان احادیث و آثار کی بنیادی کتابوں سے ہے جن سے حنفیہ استدلال کرتے ہیں ۔ اس میں امام محمد نے اپنی سند سے وہ روایات جمع کی ہیں جو امام ابو حنیفہ کے ذریعے انھیں پہنچیں ۔ اس کے راویوں کے حالات میں قاسم نے یہ کتاب لکھی ۔

٥٦ـــرجال مسند ابی حنیفہ لابن المقری[5] : ابن المقری کی مذکورہ بالا مسند کے راویوں کے حالات اس کتاب میں درج کیے ہیں ۔

۵۷ـــترتیب الإرشاد للخلیلی[6] : حافظ ابویعلی[1] خلیل بن عبد اللہ بن احمد القزوینی الخلیلی (م ٤٤٦ ھ) حفاظ حدیث میں سے ہیں ۔ انھوں نے اپنی کتاب «الارشاد فی علماء البلاد» میں ابتدائے اسلام سے اپنے وقت تک کے محدثین کا تذکرہ ممالک کے ناموں کی ترتیب سے کیا ہے ۔ قاسم نے اس کی ترتیب بدل کر علماء کے ناموں کے پہلے حرف کے مطابق کردی ہے ۔

---

(۱) بروکلمن ۲ : ۸۱ (۹۹) ۔

(۲) الضوء ٦ : ۱۸٦ ؛ شذرات ۷ : ۳۲٦ ؛ کشف : ۱۷۲۸ اور اسماء المؤلفین ۱ : ۸۳۰ میں اس کا نام «الإیثار برجال معانی الآثار» دیا ہے۔

(۳) الضوء ٦ : ۱۸٦ ۔

(٤) الضوء ٦ : ۱۸٦

(٥) الضوء ٦ : ۱۸٦۔

(٦) الضوء ٦ : ۱۸٦ ؛ کشف : ۷۰ ؛ «بستان المحدثین» میں اس کا نام «ارشاد فی معرفۃ المحدثین» دیا ہے ۔

٥٨ـــ من روى عن أبيه عن جدّه[1] : بعض اوقات اسناد حديث میں بجاے نام کی تصریح کے عن أبيه عن جدّه ملتا ہے اور اس میں التباس ہوجاتا ہے کہ کس کے جد سے مراد ہے . قاسم نے اس کتاب میں ایسے لوگوں کے ناموں کی تصریحات کی ہیں اور راوی کی مراد سے مطلع کیا ہے .

٥٩ـــ إصلاح ثقات العجلي[2] : حافظ ابوالحسن احمد بن عبدالله بن صالح العجلی (م ٢٦١ ھ) مشہور محدث اور ماہر فن رجال ہیں . انہوں نے ثقہ راویوں کے حالات میں ایک کتاب لکھی ہے قاسم نے پیش کردہ معلومات کی تصحیح کی ہے .

٦٠ـــ إصلاح زوائد العجلي[3] : زوائد سے مراد وہ راوی ہوتے ہیں جو صحاح ستہ کی اسانید میں نہ آئے ہوں . عجلی نے ایسے راویوں کے حالات جمع کیے . قاسم نے اس کی بھی تصحیح کی . مختصر سی کتاب تھی .

٦١ـــ زوائد رجال مؤطا[4] : قاسم نے « مؤطا » کے مذکورہ بالا قسم کے رواۃ کے حالات جمع کیے ہیں .

٦٢ـــ زوائد رجال مسند شافعي[5] : « مسند شافعی » کے ایسے ہی راویوں کے حالات جمع کیے ہیں .

٦٣ـــ زوائد رجال سنن الدارقطني على الستة[6] : دارقطنی کی سنن کے ایسے ہی رواۃ کے احوال .

٦٤ـــ الثقاة ممن لم يقع في الكتب الستة[7] : قاسم نے راویوں کے

---

(١) الضوء ٦ : ١٨٧ ؛ كشف : ١٤٦٤ ؛ اسماء المؤلفين ١ : ٨٣١ میں اس کا نام « كتاب من روى عن أبيه وجدّه » دیا ہے .

(٢) الضوء ٦ : ١٨٧؛ اسماء المؤلفين ١ : ٨٣٠ نے نام « الاهتمام الكلي باصلاح ثقات العجلي » دیا ہے .

(٣) الضوء ٦ : ١٨٧ (٤) الضوء ٦ : ١٨٧

(٥) الضوء ٦ : ١٨٧ (٦) الضوء ٦ : ١٨٧

(٧) الضوء ٦ : ١٨٧ ؛ غالباً یہی کتاب ہے جس کا ذکر بروکلمن : تکملہ ٢ : ٩٣ میں « الثقاة من الرواة » کے نام سے ملتا ہے ؛ شذرات ٧ : ٣٢٦ میں اس کا نام « ثقات الرجال » دیا ہے .

حالات جمع کیے ہیں جو اگرچہ ثقہ ہیں مگر ان کی روایت صحاح ستہ میں شامل نہ ہوسکی۔ یہ کتاب چار جلدوں میں مکمل ہوئی تھی۔

۶۵۔ تقویم اللسان فی الضعفاء[1] : ابن حجر عسقلانی کی کتاب «لسان المیزان» میں جن راویوں کو ضعیف بتایا گیا ہے ان پر قاسم نے گفتگو کی ہے۔ یہ کتاب دو جلدوں میں تھی۔

۶۶۔ فصول اللسان[2] : یہ بھی ابن حجر کی «لسان» پر لکھی گئی۔

۶۷۔ حاشیہ علی مشتبہ[3] : ابن حجر کی کتاب «تبصیر المنتبہ بتحریر المشتبہ» ایسے راویان حدیث کے بارے میں ہے جن کے قبایل، مقام سکونت، نام، کنیت، یا پیشے کے بارے میں باہم اشتباہ ہوجاتا ہے۔ اس پر قاسم نے حاشیہ لکھا ہے

۶۸۔ حاشیة علی التقریب[4] : ابن حجر کی کتاب «تقریب التہذیب» پر حاشیہ ہے۔

۶۹۔ تلخیص سیرة مغلطائی[5] : مغلطائی بن قلیج (م ۷۶۷ ھ) مشہور محدث نے سیرت نبوی پر ایک مشہور کتاب لکھی ہے اس کی تلخیص قاسم نے کی۔

۷۰ - تلخیص دولة الترک[6]۔

۷۱۔ منتقی درة الاسلاک فی دولة الاتراک[7]: بدرالدین حسن ابن حبیب الحلبی (م ۷۷۹ ھ) نے مملوک عہد کی سن وار تاریخ لکھی جس میں ۶۴۸ ہجری کے اواخر تک، کے حالات بیان کیے۔ اس کی عبارت نہایت مقفی مسجع اور

---

(۱) الضوء ۶ : ۱۸۷ ؛ کشف : ۴۷۰ ، نام صرف « تقویم اللسان » دیا ہے ؛ ذیل تذکرة الحفاظ : ۳۵ ت ؛ اسماء المؤلفین ۱ : ۸۳۰ میں اس کا نام « تقویم اللسان فی شرح المیزان » دیا ہے۔

(۲) الضوء ۶ : ۱۸۷ ؛ ذیل تذکرة الحفاظ : ۳۵ ت۔

(۳) الضوء ۶ : ۱۸۷ ۔

(۴) الضوء ۶ : ۱۸۷

(۵) الضوء ۶ : ۱۸۷

(۶) الضوء ۶ : ۱۸۷

(۷) کشف : ۷۳۷ ، ۷۳۸

پیچیدہ تھی۔ ابن تغری بردی نے «المنهل الصافی» میں سلیمان بن مهنا کے ترجمے میں اس پر سخت اعتراضات کیے ہیں اور ایک دوسری جگہ بتایا ہے کہ مؤلف نے لوگوں کی پیدائش اور وفات کی تاریخ تک نہیں دی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ نگاری کے بجائے اس کا مقصد مقفی عبارتیں لکھنا تھا۔ قاسم نے اس کتاب کا انتخاب تیار کیا تھا مگر یہ انتخاب پایۂ تکمیل کو نہ پہنچا۔

۷۲—منتقی من درر الاسلاک فی قضاة مصر[1]۔

۷۳—تراجم مشایخ المشایخ[2]: قاسم نے اپنے اساتذہ کے اساتذہ کے حالات لکھے ہیں۔

۷٤—تراجم مشایخ شیوخ عصر[3]: اپنے ہم عصر علماء کے اساتذہ کے حالات لکھے ہیں۔ یہ کتاب بھی نامکمل رہی۔

۷۵—معجم الشیوخ[4]: قاسم نے اپنے اساتذہ کے حالات حروف تہجی کی ترتیب سے جمع کیے ہیں۔

۷٦—تاج التراجم فی من صنف من الحنفیة[5]: صاحب تصنیف حنفی علماء کے حالات میں ہے۔ اس کتاب کی تصنیف کا خیال قاسم کو مقریزی کے مؤلفہ تذکرہ کو دیکھ کر ہوا جس میں مقریزی نے حنفی علماء کے حالات بھی دیے تھے۔ یہ کتاب چھپ چکی ہے۔

---

(۱) الضوء ٦ : ۱۸۷. ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ۲، ۳، ٤، ایک ہی کتاب ہے جس کے نام کی روایت میں اشتباہ یا غلطی ہوگئی ہے۔

(۲) الضوء ٦ : ۱۸۷.

(۳) الضوء ٦ : ۱۸۷

(٤) الضوء ٦ : ۱۸۷ ؛ اسماء المؤلفین ۱ : ۸۳۱ ؛ کشف : ۱۷۳۵ .

(۵) کشف : ۲٦۹ ؛ اسماء المؤلفین ۱ : ۸۳۰ ؛ الضوء ٦ : ۱۸۷ ؛ بروکلمن ۲ : ۸۱ (۹۹)، تکملہ ۲ : ۹۳؛ فہرس کتب خانۂ چسٹربیٹی (ڈبلن، ۱۹۵۵ء) ۱ : ۸۲، رقم: ۳۵۷۲ (۳)؛ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری، ذخیرۂ فرنگی محل مخطوطہ رقم ۵۳۲ : ٥٤ .

**اصول فقہ:**

۷۷—حاشیة علی التلویح شرح التوضیح علی متن التنقیح[1] : کچھ لوگوں نے بزدوی کی کتاب «الاصول» پر اعتراضات کیے تھے چنانچہ صدر الشریعة عبید اللہ بن مسعود المحبوبی البخاری (م ۷٤۷ ھ) نے ان مباحث کی تنقیح و توجیہ کرتے ہوئے اور «محصول»، «اصول ابن الحاجب» کے مباحث لے کر ان پر خود اپنی تحقیقات کا اضافہ کرکے «التنقیح» کے نام سے ایک متن اصول فقہ میں مرتب کیا۔ ایجاز و اختصار کی وجہ سے اس کی عبارت نہایت مشکل تھی چنانچہ خود ہی ایک ممزوج شرح «التوضیح» کے نام سے لکھی۔ اس شرح کی سب سے مشہور شرح بالقول تفتازانی (م ۷۹۲ ھ) نے «التلویح» کے نام سے لکھی۔ اسی شرح پر قاسم نے حاشیہ لکھا ہے[2]۔

۷۸—شرح الورقات[3] : «ورقات»[4] اصول فقہ میں امام الحرمین الجوینی الشافعی (م ٤٦۸ ھ) کی مشہور تصنیف ہے۔ قاسم نے اس کتاب کی شرح کی ہے۔ یہ شرح ۸۲۰ ھ کے اوائل اور ۸۲۱ ھ کے اواخر کی تصنیف ہے۔ اس طرح یہ قاسم کی غالباً دوسری تصنیف قرار پاتی ہے۔

۷۹—أجوبة عن اعتراضات العز بن جماعة علی اصول الحنفیة[5] : قاسم کے استاد عز بن جماعة شافعی تھے اور حنفیہ کے اصول فقہ پر سختی سے نکتہ چینی کرتے تھے۔ قاسم نے ان کے اعتراضات کے جوابات دیے ہیں۔

۸۰—شرح مختصر المنار[6] : المنار حنفی اصول فقہ میں عبداللہ بن احمد

---

(۱) کشف : ٤۹۹ .

(۲) یہ حاشیہ صرف بحث سنت تک پہنچ سکا : شذرات ۷ : ۳۲٦.

(۳) الضوء ٦ : ۱۸۷؛ کشف ۲۰۰٦؛ اسماء المؤلفین ۱ : ۸۳۱ .

(٤) اس نام کی وجہ مصنف کے دیباچے کے یہ الفاظ ہیں «هذه ورقات قلیلة تشتمل علی معرفة فصول من اصول الفقه».

(٥) الضوء ٦ : ۱۸۷.

(٦) الضوء ٦ : ۱۸۷؛ اسماء المؤلفین ۱ : ۸۳۱؛ بروکلمن، تکملہ ۲ : ۹۳؛ فہرس چسٹربیٹی لائبریری رقم : ۳۵۷۲ : ۲؛ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری، ذخیرۂ فرنگی محل رقم ۵۹۹ : ۲۰

حافظ الدین نسفی (م ۷۱۰ ھ) کا تالیف کیا ہوا مشہور متن ہے . اس کا اختصار طاہر بن الحسن بن عمر حبیب الحلبی نے کیا . قاسم نے اسی مختصر کی شرح کی ہے اور اس میں توجہ زیادہ تر حل الفاظ کی طرف کی ہے . تالیف کی وجہ یہ ہوئی تھی کہ عثمان بن اغلبک الحلبی[1] نے ان سے طاہر کی مختصر المنار پڑھنا شروع کی تھی قاسم نے الفاظ کے حل کے لیے اسے یہ شرح املا کرادی[2].

۸۱ــحاشیة علی شرح المنار لابن ملک[3] : منار کی ایک متداول شرح عبداللطیف بن الملک (م تقریباً ۸۸۵ ھ) نے لکھی ہے قاسم نے اس شرح پر حواشی تحریر کیے ہیں .

۸۲ــحاشیة علی شرح تنقیح الاصول لنقرہ‌کار[4] .

۸۳ــتحریر الانظار فی أجوبة ابن العطار[5] : مختصر سا رسالہ ایک اصول فقہ کے مسئلے پر ہے «وھو فی قول المحققین من ائمتنا ان النفی والإثبات اذا تعارضا وکان (کان النفی) مما یعلم بدلیلہ فانہ یقضی علی المثبت» .

فرائض:

۸٤ــشرح فرائض کافی[6] : حافظ الدین نسفی کی کتاب «الکافی فی فروع الحنفیة» کے صرف اس حصے کی شرح ہے جو فرائض سے بحث کرتا ہے .

(۱) عثمان بن احمد بن سلیمان بن اغلبک ، فخر الدین ، (م ۸۸۵ھ) ، حلب کے امراء اور فقہ کے ماہرین میں تھا . اہم عہدوں پر سرفراز رہا. نظم و نثر ، کتابت اور تاریخی وقائع میں شہرت حاصل تھی : الضوء ٥ : ۱۲٥.

(۲) مقدمہ شرح مختصر المنار.

(۳) کشف : ۱۸۲٥ ؛ اسماء المؤلفین ۱ : ۸۳۰.

(٤) اسماء المؤلفین ۱ : ۸۳۰ .

(٥) الضوء ٦ : ۱۸۷ ؛ کشف : ۳٥٦ میں اس کا نام «تحریر الانکار فی جواب ابن العطار» ہے اور اسماء المؤلفین ۱ : ۸۳۰ میں «تحریر الانظار فی جواب ابن العطار» .

(٦) الضوء ٦ : ۱۸۷.

٨٥۔شرح فرائض مجمع البحرين[1] : احمد بن علی بن ثعلب، مظفرالدين معروف به ابن الساعاتی کی کتاب «مجمع البحرين» کے صرف فرائض کی ممزوج شرح ہے۔

٨٦۔شرح رسالة السيد فی الفرائض[2] : قاسم کے استاد السيد علی نے، جو اپنے زمانے میں فرائض کے ماہر ترین آدمی سمجھے جاتے تھے، فرائض پر ایک رساله لکھا تھا جس کی شرح قاسم نے کی۔

٨٧۔شرح مختصر الکافی فی الفرائض لابن المجدی[3] : قاسم کے استاد السيد علی فرائض وحساب میں ابن المجدی کے شاگرد تھے۔ قاسم نے استاذ الاستاذ کی کتاب کی شرح کی ہے۔ ضخیم کتاب تھی۔

٨٨۔جامعة الاصول فی الفرائض[4] : یه وهی کتاب هے جس سے ٨٢٠ ھ میں قاسم کی تصنیفی زندگی کا آغاز هوا۔

٨٩۔شرح فرائض السجاوندی[5]: «سراجیه» کی شرح هے۔

فقه :

٩٠۔شرح قدوری[6] : ابوالحسین احمد بن محمد القدوری البغدادی (م ٤٢٨ ھ) اکابر فقہائے حنیفه میں سے ہیں۔ ان کی کتاب «المختصر» فقه حنفی کی معتبر ترین کتابوں میں سے ہے۔ اس کتاب پر بہت سے شرحیں لکھی گئیں جو اپنی جگه خود مستقل کتابیں ہیں۔ قاسم نے بھی اس کی شرح لکھی ہے۔

---

(١) الضوء ٦ : ١٨٧؛ اسماء المؤلفين ١ : ٨٣١؛ شذرات ٧ : ٣٢٦.

(٢) الضوء ٦ : ١٨٧.

(٣) الضوء ٦ : ١٨٧؛ اسماء المؤلفين ١ : ٨٣١ میں نام «شرح مختصر ابن المجدی فی الفرائض» دیا هے۔

(٤) الضوء ٦ : ١٨٧؛ اسماء المؤلفين ١ : ٨٣٠.

(٥) اسماء المؤلفين ١ : ٨٣١.

(٦) الضوء ٦ : ١٨٧؛ کشف : ١٦٣٤ اور اسماء المؤلفين ١ : ٨٣٠ میں اس کا نام «الترجيح و التصحيح علی القدوری» دیا هوا هے؛ بروکلمن، تکمله ٢ : ٩٣ میں نام «تصحيح القدوري» هے۔

٩١—شرح نقایه[1] : صدر الشریعة عبید اللہ بن مسعود (م ٧٤٥ ھ) کی کتاب «مختصر الوقایه» اور اس کا اختصار «نقایه» جو ان کے صاحب زادے برهان الشریعة محمود بن صدر الشریعة الاول عبید اللہ المحبوبی نے کیا یه دونوں کتابیں حنفی فقه کے اهم ترین متون میں سے هیں. «نقایه» میں بےحد اختصار و ایجاز برتا گیا هے جس کی وجه سے فهم مطلب میں سخت دشواری هوتی هے چنانچه اس کی متعدد شرحیں لکھی گئیں. قاسم نے بھی اس کتاب کی شرح لکھی هے. قاسم کے ایک مشهور هم‌عصر تقی الدین ابوالعباس احمد بن الشمنی (م ٨٧٢ ھ) هیں، انهوں نے بھی «نقایه» کی شرح لکھی تھی. سخاوی کا کهنا هے که شمنی، جو ان کے بھی استاد هیں، کها کرتے تھے که قاسم نے اُن کی شرح کو توڑ موڑ کر اپنی شرح تالیف کرلی چنانچه انهوں نے «نقایه» کی ایک اور شرح «اکمال الدرایة» کے نام سے لکھی جو ان کی موت سے کچھ هی عرصے پہلے پوری هوئی[2].

٩٢—شرح درر البحار للقونوی فی الفروع[3]: شمس الدین ابو عبداللہ محمد بن یوسف بن الیاس القونوی الدمشقی الحنفی م ٧٨٨ ھ نے «درر البحار» کے نام سے ایک مختصر متن تصنیف کیا جس میں فقه حنفی کے مسائل ابن الساعاتی کی کتاب «مجمع البحرین» سے لے کر ان کے ساتھ امام احمد بن حنبل، شافعی اور مالک کا مذهب بھی پیش کیا. قاسم نے اس کتاب کی شرح لکھی[4].

٩٣—شرح مختصر الطحاوی فی الفروع:[5] ابو جعفر احمد بن محمد طحاوی

---

(١) الضوء ٦ : ١٨٧؛ کشف : ١٩٧١؛ اسماء المؤلفین ١ : ٨٣١ میں بتایا هے که کتاب نامکمل رهی.

(٢) الضوء ٦ : ١٨٧

(٣) الضوء ٦ : ١٨٧ میں نام «شرح درر البحار فی المذاهب الاربعة» دیا هے؛ اسماء المؤلفین ١ : ٨٣٠؛ شذرات ٧ : ٣٢٦.

(٤) قاسم نے اس کی شرح مختصر اور مطول دو طرح تیار کی تھی. مطول پوری نه هوسکی. الضوء ٦ : ١٨٧.

(٥) اسماء المؤلفین ١ : ٨٣١

(م ۳۲۱ ھ) نے فقہ میں مزنی کی کتاب «المختصر» کے نمونے پر اپنی «مختصر» ترتیب دی . قاسم نے اس کی شرح کی ہے .

۹۴ اجوبة عن اعتراضات ابن العز[۱].

۹۵ــشرح مختصر المختصر[۲].

۹۶ــاجوبة عن اعتراضات ابن العز على الهداية[۳] : ابن العز کے «هدایه» پر اعتراضات کے جواب .

۹۷ــتصحیح علی مجمع البحرین لابن الساعاتی[٤].

۹۸ــشرح المختار للموصلی فی الفروع[٥]: ابوالفضل مجدالدین الموصلی ، کی کتاب «المختار» کی شرح ہے

۹۹ــترجیح الاقوال المعتبرة بین اصحابنا الحنفیه[٦]: فقه حنفی کے راجح و مرجوح مسائل کے بارے میں ہے .

۱۰۰ــفتاوی قاسم بن قطلوبغا[۷]: قاسم کی اس تصنیف کا ذکر سخاوی کی «الضوء» یا بقاعی کی «عنوان» میں نہیں ملتا . اگرچہ یہ حتمی دلیل اس بات کی نہیں ہے کہ اس کو قاسم کے بعد جمع کیا اور ترتیب دیا گیا تاہم قاسم کے اکثر رسائل کا اس میں موجود ہونا اس بات کا قرینہ ہے کہ قاسم کے کسی شاگرد یا عقیدت مند نے اپنے استاد کی تحریروں کو جو فقہی مسائل سے متعلق تھیں یکجا کردیا ہو جیسا کہ ایک دوسری تصنیف کے بارے میں معلوم ہوگا . یہ کتاب جو قاسم کے علم، تفقہ ، وسعت مطالعه اور ذہانت کا بڑا اچھا نمونہ پیش کرتی ہے ہنوز غیر مطبوعہ ہے . علی‌گڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری کے ذخیرۂ فرنگی محل میں اس کا قلمی نسخه

(۱) الضوء ٦ : ۱۸۷ .
(۲) الضوء ٦ : ۱۸۷
(۳) الضوء ٦ : ۱۸۷
(٤) شذرات ۷ : ۳۲٦
(٥) اسماء المؤلفین ۱ : ۸۳۱
(٦) بروکلمن ، تکمله ۲ : ۹۳
(۷) کشف : ۱۲۲۷ «الفتاوی القاسمیة» ؛ اسماء المؤلفین ۱ : ۸۳۱ بروکلمن ۲ : ۸۱ (۹۹)؛ ذخیرۂ فرنگی محل ، علی‌گڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری، مخطوطه رقم ۲۱۰ : ۱۹ .

۲۲۳ اوراق پر مشتمل ہے اس نسخے پر مولانا عبدالحی فرنگی محلی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک تفصیلی فہرست مضامین ہے جس کا عنوان «فہرس فی فتاوی العلامۃ قاسم بن قطلوبغا الحنفی تلمیذ ابن الہمام، من المسائل والفوائد و الرسائل» ہے اور جس کی تاریخ تحریر ۱۲۹۵ ہجری ہے۔ اس تحریر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خود مولانا عبدالحی نے اس نسخے کو نقل کرایا تھا مگر تاریخ کتابت اور کاتب کا نام وغیرہ کچھ درج نہیں ہے۔ اس نسخے کے آخر میں قاسم کے استاد بھائی علامہ شمس الدین محمد بن محمد معروف بہ ابن امیر الحاج الحلبی کا رسالہ «تعریف المسترشد حکم الغرس فی المسجد» بھی شامل ہے جو ان کے قلم سے ۸۷۹ھ میں نکلا جب وہ حج سے واپسی میں بیت المقدس میں تشریف رکھتے تھے اور جو مسجد اقصی میں درخت لگانے کے بارے میں ہے۔ اس نسخے کے آخر میں جو عبارت ہے اس میں «تمت الفواید...» لکھا ہوا ملتا ہے جس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ قاسم کی جو تصنیف «الفواید[1]» کے نام سے ملتی ہے وہ یہی تو نہیں ہے جو «الفتاوی» کے نام سے بھی مشہور ہوئی ہو۔ مگر دقت یہ ہے کہ «فتاوی» کے نام سے بروکلمن جس کتاب کا نام دیتا ہے اسے علحدہ درج کرتا ہے، تاہم یہ قطعی دلیل اس بات کی نہیں کہ دونوں دو علحدہ کتابیں ہوں کیونکہ بروکلمن کا بڑا اعتماد کتب خانوں کی فہرستوں پر ہے اس لیے یقینی طور سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

۱۰۱ — مجموعۃ رسائل قاسم بن قطلوبغا[2]: اس کتاب کا تذکرہ معروف فہارس میں نہیں ملتا۔ ذخیرۂ حبیب گنج میں مخطوطہ رقم ۱۸: ۶ کا نام دستی فہرست میں «القول القایم» دیا ہوا ہے یہ صحیح نہیں۔ مخطوطے کے پہلے ورق پر جو نام دیا گیا ہے یعنی «مجموعہ رسایل شیخ قاسم بن قطلوبغا الحنفی و بعض فتاوی علماء مصر» وہ محتویات کتاب کے پیش نظر صحیح معلوم

---

(۱) بروکلمن، تکملہ ۲: ۹۳

(۲) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری، ذخیرۂ حبیب گنج، مخطوطہ رقم ۱۸: ۶۔

ہوتا ہے۔ یہ نسخہ نواب صدر یار جنگ بہادر حبیب الرحمن خاں شیروانی مرحوم نے ۲۲ رجب ۱۳۴۵ھ کو، جیسا کہ ان کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے، حیدرآباد میں خریدا تھا۔ اس پر دو مہریں شاہی کتب خانوں کی لگی ہوئی ہیں۔ اس نسخے پر جگہ جگہ محمد عبد العظیم المکی الحنفی[1] کے ہاتھ کے لکھے ہوئے حواشی ہیں جو ۱۰۵۰ھ میں مکہ معظمہ میں مفتی حنفیہ تھے۔ یہ نسخہ ایک دوسرے نسخے کی نقل ہے چنانچہ ورق ۵۳ الف پر حاشیے میں «من الأصل المنقول بیاض سطرین» اور اسی طرح ۵۲ ب کے حاشیے پر «فی الاصل بیاض سطرین» کے الفاظ ملتے ہیں۔ نسخے کے کاتب کا نام ۵ ب، ۵۴ الف اور ۱۰۱ ب پر دیا ہوا تھا جس میں سے پہلی اور آخری جگہ سے نام کھرچ کر مٹادیا گیا۔ صرف ۵۴ الف پر جہاں نام غالباً اتفاقاً رہ گیا ہے یہ عبارت ملتی ہے:

«بتاریخ یوم الست حادی عشرین صفرالخیر عام ثمانیة و خمسین و تسعمایة علی ید الفقیر الی اللہ تعالی محمد بن یحیی الرسولی الحنفی لطف اللہ بهما آمین»

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۹۵۸ھ تک کاتب مذکور ۵۴ الف تک کتابت کر پایا تھا۔ نقل و کتابت کا اختتام جیسا کہ ورق ۱۰۱ ب سے ظاہر ہے سنیچر کی رات کو ۱۰ صفر ۹۵۹ھ کو تحریر مذکورہ بالا کے قریب ایک سال بعد ہوا۔ ورق ۱۰۱ ب پر آخری سطور یہ ملتی ہیں:

«فرغت عن کتابته ید جامعه الفقیر المعترف بالعجز و التقصیر ابی محمد عبدالبر بن محمد بن محمد بن محمد بن محمد بن محمود

---

(۱) بروکلمن، تکملہ ۲ : ۹۴۸؛ ان کے رسالے «القول السدید فی بعض مسائل الاجتهاد والتقلید» کا ایک مخطوطہ ذخیرہ فرنگی محل رقم: ۴۵۱ : ۱۵۹ میں موجود ہے۔ گیارہ صفحے کا چھوٹی تقطیع کا رسالہ ہے۔ اس کے ساتھ «محمود بن احمد بن مسعود القونوی الحنفی کا رسالہ «فی عدم فساد الصلوة برفع الیدین فیها» اور علامہ بدرالدین الشهاوی کا رسالہ «یجوز اقتداء المتنفل بالمفترض لاعکسه» بھی مجلد ہیں۔ اس مجموعے کی تاریخ کتابت شعبان ۱۱۱۱ھ ہے۔

بن الشحنة الحنفی غفر الله لہم و عفی عنہم فی یوم الخمیس الحادی و عشرین من شہر رمضان المعظم قدرہ و حرمتہ الواقع فی شہور سنة ثمانین و ثمانمایة ختمہا الله بخیر . . . انتہی من المسودة التی کتبت عن مسودة المصنف رحمہ الله تعالی بتاریخ یوم السبت حادی عشرین صفر الخیر عام ثمانیة و خمسین و تسعمایة علی ید الفقیر الی الله تعالی محمد بن یحیی الرسولی الحنفی لطف الله بہما آمین »

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اصل منقول عنہ عبدالبر بن الشحنة کی تالیف اور انہیں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی . سال کتابت ۸۸۰ ھ ہے . فتنۂ ابن الفارض[1] اور قاسم کے تلامذہ کے ذکر[2] میں ہم بتاچکے ہیں کہ عبدالبر بن الشحنة ( ۸۵۱ ھ ـ ۹۲۱ ھ) اور ان کے والد محب بن الشحنة دونوں قاسم کے نیازمندوں میں سے تھے . عبدالبر کو فقہ قاسم ہی نے پڑھایا اور افتاء کی اجازت بھی انھوں نے ہی دی مگر بعد کو فتنۂ ابن الفارض کے سلسلے میں دونوں باپ بیٹوں کے تعلقات قاسم سے حد درجہ خراب ہوگئے تھے . فتنۂ ابن الفارض کا زمانہ ۸۷٤ ھ ـ ۸۷۵ ھ ہے . اس وقت عبدالبر کی عمر قریب ۲۳ سال کی تھی . اس واقعے کے چار پانچ سال بعد قاسم کی وفات کے ڈیڑھ سال بعد عبدالبر نے ۲۸ سال کی عمر میں اپنے استاد کے بعض اہم رسائل کو بعض دیگر مصری علماء کے فتاوی کے ساتھ جمع کیا . اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاگرد اور استاد میں ایک دینی مسئلے پر جو باہم کشیدگی ہوگئی تھی اسے موت نے بالآخر دور کردیا اور شاگرد کو استاد کی عظمت کا اعتراف کرنا پڑا . قاسم کا ذکر انتہائی عمدہ الفاظ میں اس کتاب میں ملتا ہے مثلاً « کتاب القول القایم فی بیان تاثیر حکم الحاکم تالیف الشیخ الإمام العالم العامل العلامة وحید دہرہ

---

(۱) فضل الرحمن : قاسم بن قطلوبغا الحنفی ، مجلۂ علوم اسلامیہ (دسمبر ۱۹۶۳ء) ص ۸۲ .

(۲) ایضاً : ۸۸ ، ۷۵ .

و فرید عصرہ ابی المعالی زین الدین قاسم الحنفی عامله اللہ بلطفه الخفی و والدیه » یا «قال شیخنا العالم العامل العلامة » وغیرہ۔ اس سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ قاسم کا پایہ فقہ میں کتنا اونچا تھا کہ مخالفوں تک کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہ تھا وہاں دوسری طرف یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ساری بدمزگی کے باوجود شاگرد تہ دل سے اپنے استاد کے تبحر علمی کا قائل تھا اور جب موت نے مخالفتوں کے زخموں کو مندمل کردیا تو اس نے اس کے اعتراف میں کوئی باک محسوس نہیں کیا۔

ذخیرۂ حبیب گنج کا زیر نظر نسخہ عبدالبر بن الشحنة کی موت کے ۳۸ سال بعد کا لکھا ہوا ہے۔ یہ نسخہ مفتی محمد عبدالعظیم کے بعد ان کے صاحب زادے عبداللہ کے پاس رہا اور پھر پتا نہیں کس کس کی ملکیت میں منتقل ہوا۔ اس ادل بدل میں اس کے بہت سے اوراق ضائع ہوگئے۔ شروع میں ایک ناقص الاول فہرست مضامین ملتی ہے جو ورق ۸۱ سے آگے کی ہے۔ متن میں ورق ۷ کے بعد ورق ۳۸ ملتا ہے اس کے بعد پھر ۵۹ سے ٦٦ تک اوراق غائب ہیں اور اسی طرح ۷٤ سے ۹۹ تک۔ کل اوراق جن پر نمبر درج ہے ۱۰۱ ہیں۔ اس میں قاسم کے یہ رسائل ملتے ہیں: القول القایم؛ فی وقف البنا دون الارض؛ فی شخص بیدہ حصة من عقار ثبت ملکه لبإسنة احدی و خمسین و ادعی آخر انہا له بحجة ثابتة سنته سبع واربعین؛ تزکیة الشہود، (ناقص الأول)؛ الفارة اذا ماتت فی الزیت؛ تعلیق الطلاق بالنکاح؛ رجل استاجر وقفا من ناظر شرعی؛ مسئلة الإستبدال؛ العصمة عن الخطأ؛ رفع الاشتباہ۔ ان کے علاوہ قاسم کے کچھ دوسرے مختصر فتاوی اور بعض دیگر علمائے مصر کے فتاوی اور رسالے بھی اس میں شامل ہیں۔ مثلاً ابن العطار کا رسالہ «فضل العلم علی الجہاد»؛ اوقاف کے بارے میں تفصیلی سوال اور ابن حجر العسقلانی الشافعی، سراج الدین عمر بلقینی الشافعی، قاضی ابو محمد محمود بن احمد العینی الحنفی، علامہ محمد بن محمد عامر المالکی اور قاضی القضاۃ شہاب الدین احمد بن ابراہیم ابن نصراللہ ابن احمد الکنانی الحنبلی کے

جوابات[1]؛ طاعون کے بارے میں نہایت مفصل سوال اور صالح ابن عمر بلقینی، محمود عینی ، اور محمد بن عامر مالکی کا جواب؛ ابن حجر کا رسالہ دربارۂ طاعون؛ بلقینی، عینی اور ابن عامر کے مختلف فتاوی دربارۂ حقوق مسیل ، بیع فی المسجد ، نزول عن الوظیفة ، و سیاست؛ ابن حجر ، بلقینی ، شرف الدین موسی بن احمد السبکی الشافعیون ، سعدالدین الدیری الحنفی ، قاضی القضاۃ محب الدین ابو الفضل احمد بن نصر اللہ بن احمد بن محمد البغدادی ثم المصری الحنبلی ، محمود عینی حنفی ، ابن عامر مالکی کے فتوے مکان کی بیع کے بعد اس سے منکر ہوجانے کے بارے میں[2]؛ اور عبدالبر بن الشحنة کا رسالہ «زہر الروض فی مسئلة الحوض» . اس طرح یہ کتاب ان سب حضرات کے علم وتفقہ اور طرز استدلال کے تقابلی مطالعے کا اچھا مواد بھی فراہم کرتی ہے .

۱۰۲—رسائل قاسم بن قطلوبغا : ذخیرۂ فرنگی محل میں اس مخطوطے کا نمبر ۳۱۱ : ۲۰ ہے اس میں رسائل قاسم اور ابن عبد الہادی الحنبلی تلمیذ ابن تیمیہ کی کتاب « الصارم المنکی علی نحر ابن السبکی» شامل ہیں . اس مخطوطے میں ۳۵۹ اوراق $23\frac{1}{2}\times 17$ کے ہیں . قاسم کے رسائل ص ۱۱۵ پر ختم ہوجاتے ہیں . ص ۷٤ پر مولانا عبد الحی کے ہاتھ کی یہ تحریر ہے « نقلت هذه الرسائل و الفوائد للعلامة قاسم بن قطلوبغا الحنفی تلمیذ ابن الهمام الحنفی من اصل علیه خط المفتی عبدالعظیم المکی الحنفی فی مواضع و صححت بمقابلتها فی شعبان سنة ۱۲۹۲ ہجری» جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا « مجموعہ رسائل » کی نقل مولانا عبد الحی صاحب نے اپنے لیے تیار کرائی تھی . جس وقت یہ نسخہ نقل ہوا ہے ( ۱۲۹۱–۱۲۹۲ ھ ) اس وقت وہ اپنی مذکورہ بالا ناقص حالت ہی میں تھا . «مجموعہ» کے اوراق ۸ تا ۳۷ کا مواد اس میں سے بھی غائب ہے . اس کے علاوہ رسائل قاسم کا وہ حصہ ص ۷۲

---

(۱) صرف عینی تک جوابات مکمل ہیں . عینی کا جواب بھی ناقص الآخر ہے کیونکہ ورق ۵۹ سے اوراق غائب ہیں .

(۲) صرف محب الدین حنبلی تک جواب مکمل ہیں . محب الدین کا جواب ناقص ہے اوراق ۷٤ ب سے غائب ہیں .

پر ختم ہوجاتا ہے جو «مجموعہ» سے نقل کیا گیا۔ «بعض مسائل الطلاق» کی سرخی (مجموعہ ورق ۵۵ ب) پر مجموعے کا قاسم کے رسالوں والا حصہ تمام ہوتا ہے اور اسی سرخی ص ۷٤ پر زیر نظر نسخے کا رسائل قاسم کا حصہ بھی۔ چنانچہ ص ۷٤ پر مذکورہ بالا تصریح مولانا عبدالحی کے ہاتھ کی موجود ہے۔ ص ۷٤ تا ص ۱۱۰ کسی دوسری جگہ سے دوسرے کاتب سے نقل کرایا گیا ہے مگر منقول عنہ کے بارے میں نہیں بتایا گیا اتنا البتہ پتہ چلتا ہے کہ ص ۷٤ تا ص ۱۱۵ محرم الحرام ۱۲۹۱ھ میں نقل و صحیح[1] ہوچکا تھا۔ شروع کا حصہ بعد میں محمد بن عوض بن عبداللہ ابن ابی الجمل کے ہاتھ سے نقل ہوا اس کی تصحیح کی تاریخ ۱۲۹۲ھ ہے۔

۰۳ — الفوائد[2]: یہ کتاب غالباً مذکورہ بالادونوں کتابوں میں سے ہی کوئی ہے۔

<u>فقہی رسائل:</u>

ذیل میں ہم ان رسائل کی فہرست دے رہے ہیں جو مسائل زیر بحث پر مستقل تصانیف کی حیثیت رکھتے ہیں ساتھ ہی مختصر سی تفصیل زیر بحث مسئلے کی بھی دی جاتی ہے تاکہ قاسم کے انداز بحث اور فقہی مہارت کا اندازہ ہوسکے۔

۱۰٤ — الفارة اذا ماتت فی الزیت[3]: قاسم نے بتایا ہے کہ علمائے حنفیہ

---

(۱) «کتبہ نور محمد، تحریر تاریخ بست و نہم شہر محرم الحرام ۱۲۹۱ ہجری روز پنج شنبہ غرہ صفر»، مولانا عبدالحی کے قلم سے: «صححت النسخة بالمقابلة باصلہاق رجب ۱۲۹۱ ہجری»

(۲) بروکلمن، تکملہ ۲: ۹۳۔

(۳) فتاوی قاسم بن قطلوبغا، ص ۲ تا ۱۳، مخطوطہ رقم ۳۱۰: ۱۹، ذخیرۂ فرنگی محل، علیگڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری؛ رسائل قاسم بن قطلوبغا ص ۳۰ تا ٤۰، مخطوطہ رقم ۳۱۱: ۲۰، ذخیرۂ فرنگی محل، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری؛ مجموعۂ رسائل قاسم بن قطلوبغا، ٤٤ ب تا ٤۷ ب، مخطوطہ رقم ۱۸: ٦، ذخیرۂ حبیب الرحمن خاں شیروانی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری۔ اس مجموعے کا نام دستی فہرست میں «القول القایم» غلط درج ہوگیا ہے۔ «القول» اس کا ایک رسالہ ہے۔

کا مذہب یہ ہے کہ اس صورت میں روغن ناپاک اور ناقابل اکل ہوجاتا ہے۔ کھانے کے علاوہ دوسرے استعمالات جائز ہیں۔ بعض نے سیال روغن کو ماء قلیل و کثیر پر قیاس کیا ہے۔ یہاں قاسم نے ضمناً اس امر کی تحقیق کی ہے کہ قلت و کثرت میں اعتبار مساحت کا ہوتا ہے یا حرکت کا۔ اس کے بعد نہایت تفصیل سے طہارت کی فروع کا ذکر کیا ہے جس سے قاسم کی وسعت نظر کا پتا چلتا ہے۔ مسئلہ اجمالاً یہ ہے کہ نجاست مثلاً لید وغیرہ حرق و انقلاب حقیقت سے پاک ہوجاتی ہے یا نہیں۔ اس سلسلے میں ائمۂ فقہاء میں جو اختلافات ہیں ان کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ بحوالۂ «درر البحار» امام ابو یوسف کے نزدیک ما استحال بالنار پاک نہیں، امام محمد کے نزدیک پاک ہے اور اسی پر فتوی ہے۔ چنانچہ قدوری نے «تقریب» میں بلا کسی اختلاف کے ذکر کیے بتایا ہے کہ احتراق ہمارے اصحاب کے نزدیک مطہر ہے۔ یہ اختلاف کہ جل جانے سے محمد کے نزدیک پاک ہوجاتی ہے اور ابو یوسف کے نزدیک نہیں ان رستم کا روایت کردہ ہے ابن شجاع نے ابویوسف سے دو مختلف روایتیں نقل کی ہیں۔ امام ابوحنیفہ کا ظاہر مذہب محمد کے موافق ہے۔ چنانچہ تفریعاً زیت نجس سے بنا ہوا صابون پاک ہے۔ اکثر مشایخ نے محمد کا ہی قول اختیار کیا ہے۔

قاسم مزید بتاتے ہیں کہ اس مسلک کو ابن تمیمہ نے اصح قولی العلماء قرار دیا ہے۔ ابن حزم کا بھی یہی مذہب ہے۔ اس کے بعد امام مالک کے مذہب کی تحقیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ابن حاجب کہتے ہیں کہ کثیر سیال کھانے میں اگر قلیل نجاست گرجائے تو اس کے بارے میں دو قول ہیں۔ شیخ خلیل نے اپنی شرح میں لکھا ہے کہ ایک یہ کہ قلیل نجاست سے جیسے ماء کثیر نجس نہیں ہوتا اسی طرح یہاں بھی وہ غیر مؤثر ہوگی دوسرا مشہور قول یہ ہے کہ مؤثر ہوگی۔ ابن دقیق العید نے تاثیر و عدم تاثیر کو اس امر پر منحصر رکھا کہ اس نجاست سے بچنا مشکل ہے یا نہیں، اگر مشکل ہے جیسے چوہے کی مینگنی سے تو وہ معاف ہے ورنہ نہیں۔ جامد چیزیں مثلاً شہد اور جما ہوا گھی صرف اس حد

تک ناپاک ہوں گی جہاں تک نجاست سرایت کر جائے مقدار قلیل ہو یا کثیر' اتنے حصے کو نکال پھینکا جائے گا. ابن حاجب نے یہ بھی بتایا ہے کہ کھانے کے علاوہ نجس کے استعمال مثلاً جلانے یا چوپایوں کو کھلانے میں بھی دو قول ہیں اور خلیل نے بتایا ہے کہ ان میں سے مشہور قول جواز کا ہے مگر جلانے پر یہ قید ہے کہ مسجد میں نہ جلایا جائے. نجس روغن پاک ہوسکتا ہے یا نہیں اس میں بھی ابن حاجب کے مطابق دو قول ہیں اور خلیل سے معلوم ہوتا ہے کہ مشہور قول یہ ہے کہ پاک نہیں ہوتا. ابن حاجب کا کہنا ہے کہ پاک ہوسکنے یا نہ ہوسکنے کے قول ہر ایسی نجاست میں جاری ہوں گے جس کے اعراض میں تغیر آگیا ہو مثلاً مردار کی راکھ. ابن حاجب کے علاوہ دوسروں نے عدم طہارت کو راجح بتایا ہے. امام احمد بن حنبل کے مذہب کی تحقیق میں لکھتے ہیں کہ زرکشی نے خرقی کی شرح کے حوالے سے بتایا ہے کہ سیال میں نجاست پڑجانے کے بارے میں تین قول ہیں ایک یہ کہ قلیل ہو یا کثیر ناپاک ہے فقہاء حنابلہ نے عام طور سے اسے ہی اختیار کیا ہے. دوسرے یہ کہ سیال کا وہی حکم ہے جو پانی کا یہ ابن تیمیہ کا مسلک ہے. تیسرے یہ کہ جس کی اصل پانی ہے مثلاً سرکہ وغیرہ اس کا حکم پانی کا ہے ورنہ نہیں. ناپاک روغن کے بارے میں اشہر الروایتین یہ ہے کہ چراغ میں جلانا جائز ہے، خرقی نے اسی کو اختیار کیا ہے. دوسری روایت عدم جواز کی ہے امام احمد نے ایسے روغن کو چمڑے پر لگانا اور اسے کھانا پینا ناجائز بتایا ہے اور یہی قول عام طور سے مالکیہ میں مشہور اور معتبر ہے. امام احمد سے ایک روایت یہ ہے کہ ایسے غیر مسلم کے ساتھ اسے فروخت کرنا جائز ہے جو اس کی نجاست سے باخبر ہو. ابو الخطاب وغیرہ نے چراغ میں اس روغن کے جلانے کے جواز کی روایت پر اس کی بیع کے مطلقاً جائز ہونے کی تخریج کی ہے کیونکہ جواز بیع سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ منتفع بہ ہے. پھر قاسم نے ابن مفلح الحنبلی کی «کتاب الفروع» کے حوالے سے بتایا ہے کہ کوئی نجس چیز استحالہ

اور آگ سے پاک نہیں ہوتی لیکن ایک روایت امام احمد سے یہ بھی ہے کہ ان دونوں طریقوں سے پاک ہوجاتی ہے۔ ابن مفلح نے یہ بھی بتایاہے کہ نجس روغن سے بنائے ہوئے صابن کا پاک ہونا اسی قول پر مخرج ہے۔ ان مختلف فقہی مذاہب کے معتبر اقوال کو پیش کرنے کے بعد قاسم کہتے ہیں کہ امام مالک اور احمد سے مروی اقوال بھی ہمارے اقوال کی طرح ہیں، اختلاف صرف اس میں ہے کہ کون سے قول کو ترجیح دی جائے۔ اس کے بعد نہایت تفصیل سے ان تمام احادیث کو پیش کرتے ہیں جو اس نزاع میں دلیل سمجھی جاسکتی ہیں اور مفصل گفتگو کے بعد دکھاتے ہیں کہ حنفیہ کا مسلک احادیث کے مطابق ہے۔ اس ضمن میں متعدد اصولی مباحث بھی زیر بحث آگئے ہیں مثلاً حدیث مرسل اور قول صحابی کا حنفیہ کے نزدیک حجت ہونا، اگر دو دلیلوں میں بظاہر اختلاف معلوم ہوتا ہو تو ایسی تعبیر اختیار کرنا کہ دونوں کارآمد ہوں اس سے بہتر ہے کہ دونوں میں سے کسی ایک کو لغو اور بیکار کردیا جائے «إعمال الدليلين اولى من إهمال احدهما»

١٠٥ـــالقول القايم فى بيان تاثير حكم الحاكم[1] : یہ رسالہ اس مشہور مسئلے کی تحقیق میں ہے جس کا عنوان «نفاذ قضاء القاضى ظاهراً او باطناً» ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اگر قاضی عقود و فسوخ میں جھوٹی شہادت پر فیصلہ دے دے تو امام ابو حنیفہ کے نزدیک یہ فیصلہ ظاہراً و باطناً دونوں طرح نافذ ہوگا امام ابو یوسف کا ایک قول تو یہی ہے اور دوسرا یہ ہے کہ ایسا فیصلہ صرف ظاہراً نافذ ہوگا باطناً نہیں اور یہی قول امام محمد کا ہے۔ طحاوی نے بتایا ہے کہ اس بارے میں امام محمد کا قول وہی ہے جو امام ابو حنیفہ کا ہے۔ ظاہراً نافذ ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ فیمابین

(١) الضوء ٦ : ١٨٧ ؛ اسماء المؤلفين ١ : ٨٣١ ؛ رسائل قاسم ص ٢ تا ١٦ ؛ فتاوى قاسم ص ٣٢١ تا ٣٣٨ ؛ مجموعة رسائل قاسم بن قطلوبغا ، ١ الف تا ٥ ب ، مخطوطه رقم ١٨ : ٦ ، ذخيرة شيروانى ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری ۔

الناس نافذ ہو مثلاً تمکین، نفقہ اور قسم فی النکاح وغیرہ قانونی طور پر ثابت ہوجائیں گے اور انسان اور قانون ان کا احترام کریں گے ۔ باطناً نافذ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ باری تعالیٰ کے نزدیک ثابت ہو اور انسان عند اللہ گنہ‌گار نہ ہو ۔ ظاہراً نافذ ہونے اور باطناً نافذ نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ قاضی کے فیصلہ کے بعد قانون اس چیز کو سند جواز عطا کرے گا اور اس کا احترام کرے گا اگرچہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ ثابت اور جائز نہ ہو اور جس کے حق میں فیصلہ دیا گیا ہے وہ اس سے انتفاع وغیرہ سے گنہ‌گار ہو ۔ ظاہر و باطن میں نفاذ کا مفاد یہ ہے کہ وہ قانونی اور اخلاقی دونوں طرح سے حلال و طیب ہو ۔ اس نفاذ کی شرط یہ ہے کہ دعوی کسی سبب معین کی بنا پر ہو مثلاً نکاح، بیع، طلاق یا عتاق اور قاضی گواہوں کے جھوٹا ہونے سے لاعلم ہو ۔ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ املاک مرسلہ میں صرف ظاہراً نافذ ہوتا ہے باطناً نہیں، اور اسی طرح ان معاملات میں جہاں انشاء حکم ممکن نہیں مثلاً نکاح منکوحہ و معتدہ ۔ چنانچہ عقود کی مثال یہ ہے کہ اگر عدالت میں کسی شخص نے کسی عورت سے نکاح کا دعوی کیا اور عورت منکر ہے، اس پر وہ شخص دو جھوٹے گواہ پیش کردیتا ہے، مدعی علیہا (عورت) منکوحہ یا معتدہ نہیں ہے اور قاضی اپنی دانست میں گواہوں کو معتبر سمجھکر یہ فیصلہ دے دیتا ہے کہ یہ عورت اس شخص کے نکاح میں ہے تو امام ابو حنیفہ اور ابو یوسف کے ایک قول کے مطابق اس شخص کو زناشوئی کے تعلقات رکھنا اور عورت کا اس کو اس امر کی اجازت دینا حلال و طیب ہے ۔ امام محمد، زفر اور ابو یوسف کے دوسرے قول کے مطابق ان دونوں کے لیے یہ امر حلال نہیں عند اللہ وہ گنہ گار ہوں گے ۔ یہی صورت اس وقت ہے کہ جب عورت دعوی نکاح کرے اور مرد انکاری ہو ۔ امام مالک، شافعی اور ایک روایت کے مطابق امام احمد بن حنبل کا بھی وہی مسلک ہے جو امام محمد اور زفر کا ۔ یہ مسئلہ شروع سے بحث و تمحیص کی آماج‌گاہ رہا ہے اور سطح بیں فقہاء واہل حدیث کے لیے امام ابو حنیفہ پر سخت

نکتہ چینی کا موقع فراہم کرنے والا ۔ قاسم بن قطلوبغا نے اس سلسلے کی ساری احادیث اور فقہی روایات کو پیش کرکے مسئلے کی مفصل تحقیق کی ہے اور بتایا ہے کہ امام ابو حنیفہ کا ہی مسلک زیادہ صحیح اور اسلام میں قاضی اور قضاء کے مقام سے زیادہ توافق اور اسلام کے قانون اور عدالتی نظریات سے مناسبت رکھنے والا ہے کیونکہ قاضی کا فیصلہ از قبیل انشاء ہے نہ از قبیل اخبار، قاضی کو ولایت عامہ حاصل ہے، محل قابل انشاء ہے اور موانع مرتفع، اس سب کے باوجود حکم کا نافذ نہ ہونا تعجب کی بات ہے ۔

۱۰۶ــــاحکام الصلوة علی الجنازة فی المسجد[1] : شیخ الاسلام سعد الدیری نے ابراہیم بن الجیعان کی نماز جنازہ جامع ازہر کے اندر پڑھائی۔ لوگوں کو ان کے عمل سے خیال ہوا کہ اس عمل میں کوئی کراہت نہیں۔ صورت حال یہ ہے کہ امام شافعی تو اس کے جواز کے قائل ہیں، مگر امام ابو حنیفہ، ابو یوسف اور محمد کراہت کے قائل ہیں۔ قاسم نے اس عمل کی کراہت پر دلیلیں قائم کی ہیں۔

۱۰۷ــــمسائل التراویح و الوتر و جواز الصلوة بعد الوتر[2] : کسی محمد بدر الدین نے قاسم سے سوال کیا تھا کہ تراویح سنت ہے یا کچھ اور، منفرد پڑھنا افضل ہے یا جماعت سے، وتر کے بعد نفل پڑھنے سے وتر میں کچھ نقص تو نہیں پیدا ہوجاتا۔ قاسم نے دلائل پیش کرکے بتایا کہ اس بارے میں اقامت بالجماعة سنت علی الکفایہ ہے، تراویح مسجد میں جماعت سے چھوڑنے والا تارک فضیلت ہے نہ کہ مرتکب سیئہ۔ اور

(۱) فتاویٰ ص ۱۳ تا ۲۰؛ رسائل ص ۱۱۵ تا ۱۱۸؛ کراهة صلوة الجنازة فی المسجد، ص ۱۹۸ ب تا ۱۹۹ الف مخطوطہ رقم ۳۳۵ : ۴۳، ذخیرۂ فرنگی محل، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری۔

(۲) فتاویٰ ص ۲۰ تا ۳۵؛ بروکلمن ۲ : ۸۱، (۹۹)، «رسالة فی الصلوة بعد الوتر هل هی من النوافل او لا» ۔

امام ابو حنیفہ ، محمد ، ابو یوسف کے نزدیک نفل بعد وتر میں کوئی حرج نہیں اس سے وتر میں کوئی نقص نہیں آتا ۔

۱۰۸۔الفوائد الجلة فی مسئلة اشتباه القبلة[1] : یہ رسالہ تحری کے مسئلہ پر ہے ۔ «وقایہ» «شرح وقایہ» «نقایہ»اور «مختارات النوازل» لصاحب الهدایة کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ اشتباہ سمت قبلہ کی صورت میں اگر نماز شروع کردی تو نماز ادا نہیں ہوگی چاہے سمت قبلہ ہی میں پڑھی ہو کیونکہ تحری کے ترک سے ترک واجب ہوا ۔ یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ یہ عبارتیں اس موقع کے لیے ہیں جب نماز بلا تحری شروع کرنے کے بعد دوران نماز معلوم ہوا کہ سمت قبلہ صحیح ہے کیونکہ صاحب «وقایہ» نے اس سے قبل یہ کہا ہے کہ «فان قبلها و عدم من یسأل تحری ولم یعد بعد اذا اخطأ و ان علم به مصلیا او تحول رایه الی اخری استدار و ان شرع بلا تحر ثم علم انه اصاب قال ابو یوسف مضی فیها ولا یستأنف» . «اختیار» اور دوسری کتب فقہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد فراغ معلوم ہوا کہ صحیح سمت میں نماز پڑھی ہے تو نماز ہوگئی کیونکہ تحری بطور وسیلے کے فرض ہے ، مقصود اس کے بغیر ہی حاصل ہوگیا تو کچھ حرج نہیں ۔ قاسم نے اصل مذہب کی تحقیق کی ہے ۔

۱۰۹۔احکام القہقہة[2] : قاسم سے پوچھا گیا کہ امام زرکشی نے اپنی کتاب «الحواشی علی الرافعی» میں حنفیہ پر یہ اعتراض کیا ہے کہ حدیث قہقہہ (قہقہہ سے نماز فاسد ہوجاتی ہے) نماز فرض کے بارے میں وارد ہوئی ہے ۔ حنفیہ نفل نماز کو اس پر قیاس کرتے ہیں اور قہقہہ کو نفل نماز کا بھی مفسد بتاتے ہیں ۔ تو یہ معاملہ اگر تعبدی ہے تو نفل کو اس پر کیسے قیاس کیا اور اگر معلل ہے تو نماز جنازہ کو اس پر قیاس

(۱) فتاوی ص ۳۵ تا ٤٤ ؛ الضوء ٦ : ۱۸۷ ؛ اسماء المؤلفین ۱ : ۸۳۱ فی مسئلة اشتباه ؛ کشف : ۱۲۹٦ ۔

(۲) فتاویٰ ص ٤٤ تا ٤٩ ؛ رسائل ص ۷۷ تا ۸۳ ۔

کیوں نہ کیا۔ بعض حنفیہ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ امر تعبدی ہے اور نفل نماز کو اس صورت میں دلالۃ النص کے طور پر فرض سے ملحق کیا گیا ہے نہ کہ بذریعہ قیاس یہ حکم ثابت کیا گیا ہے کیونکہ نفل نماز صلاۃ حقیقی ہے اور نماز جنازہ صلاۃ حقیقی نہیں ہے۔ قاسم نے بتایا ہے کہ یہ امر تعبدی ہے نفل کو فرض پر قیاس نہیں کیا ہے بلکہ عموم لفظ پر عمل کیا ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے «من ضحک فی الصلوۃ قہقہۃ فلیعد الوضوء و الصلوۃ»۔ جنازہ کی نماز اس میں داخل نہیں ہوتی کیوں کہ وہ صلوۃ مطلق نہیں۔ پھر بتاتے ہیں کہ بعض حنفیہ کی طرف سے جو مذکورہ جواب دیا گیا ہے وہ صحیح نہیں۔ نفل کو بطریق دلالۃالنص فرض سے ملحق کر ہی نہیں سکتے اس پر دلائل قائم کیے ہیں اور دلالۃالنص کی تشریح کرتے ہوئے مثالیں دی ہیں۔

۱۲۰ـ الاصل فی بیان الفصل والوصل[1] : قاسم کے کسی استاد نے ان سے سوال کیا کہ فرض نماز کے بعد اسکے ساتھ نفل کا ملانا کیسا ہے اور یہ بھی کہا کہ بعض حنفی علماء کا کہنا ہے کہ اس وصل کو حافظ الدین نسفی نے اختیار کیا ہے ورنہ متقدمین فقہائے حنفیہ کے یہاں یہ بات نہیں ملتی۔ قاسم نے بتایا ہے کہ اس مسئلے کو نسفی سے پہلے بہت سے فقہاء نے لکھا ہے اور ثبوت میں امام محمد کی الأصل، بدائع، شرح الشہید، ذخیرۃ شمس‌الایمۃ حلوانی اور اختیار شرح مختار کے حوالے پیش کیے ہیں اس ضمن میں مختلف فقہا کے سنین وفات کی بھی تحقیق کی ہے۔

---

(۱) الضوء ٦ : ۱۸۷ : الأصل فی الفصل و الوصل یعنی وصل‌التطوع بالفریضۃ اسماء المؤلفین ۱ : ۸۳۰ ؛ کشف ؛ بروکلمن ۲ : ۸۱ (۹۹) : رسالۃ فی وصل التطوع ؛ فتاوی ص ۵۰ تا ٦۰، ؛ رسائل ص ۱۲۲ تا ۱۲۵ : رسالۃ الأصل فی بیان الوصل و الفصل ای وصل السنن بالفرائض وفصلہا بالاوراد ؛ الأصل فی بیان الوصل و الفصل ص ۲۰۰ تا ۲۰۱، مخطوطہ رقم ۳۳۵ : ٤٤، ذخیرۃ فرنگی محل

۱۰۱ - الأسوس فی کیفیة الجلوس[1] : جلوس بین السجدتین کے بارے میں کسی نے دریافت کیا . قاسم نے بتایا کہ جو ہیئت جلسۂ تشھد کی ھے وھی اس کی بھی ھے . سائل نے کہا کہ بعض معاصر علماء نے اس کی کیفیت یہ بتائی ھے کہ پیر کھڑے کرکے ایڑیوں پر بیٹھے . قاسم نے بتایا کہ یہ نشست إقعاء کہلاتی ھے اور اس کی کراھت منصوص ھے اور سائل سے یہ بھی پوچھا کہ کتب حنفیہ میں یہ مسئلہ کہاں دیکھا . سائل نے کہا کتاب تو نہیں معلوم مگر سراج الدین قارئ الهدایة (المذکور سابقا) نے یہ مسئلہ بتایا ھے . قاسم نے اپنے رسالے میں کیفیت نشست کی تحقیق کی ھے . قاسم کا کہنا ھے کہ نشست کی پانچ صورتیں ھیں : ۱ - التربع ۲ - ان یضجع قدمیه ویجلس علیهما ۳ - ان ینصب ساقیه و یلزق الیتیه بالارض و یدیه وهذا هو الإقعاء المشهور ٤ - ان ینصب رجله الیمنی ویؤخر الأخری و یجلس علی الأرض و هذا هو التورک ٥ - ان ینصب قدمه الیمنی و نفرش الأخری ویجلس علیه و هذا هو الإفتراش . اس کے بعد نبی کریم علیه الصلوة والسلام اور صحابہ کے عمل کے ذریعے اس بات کی وضاحت کی ھے کہ نشست کا طریقہ کیا تھا . قاسم کہتے ھیں کہ تربع نماز کے سارے جلسات میں مکروہ ھے اسی طرح اضجاع القدمین بھی ، نصب القدمین و الجلوس علی القصبین بھی نماز کی تمام نشستوں میں مکروہ ھے اور اس میں کوئی اختلاف علاوہ اس قول کے نہیں ھے جو نووی نے «شرح المهذب» میں امام شافعی کی طرف منسوب کیا ھے کہ اس طرح دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھنا مستحب ھے . امام ابو حنیفہ ، امام ابو یوسف اور امام محمد تینوں سے اس کی نہی منقول ھے .

۱۰۲ - تحریر الأقوال فی صوم الست من شوال[2] : ابو عبدالله محمد بن

---

(۱) الضوء ٦ : ۱۸۷ ؛ اسماء ۱ : ۸۳۰ ؛ کشف ؛ فتاوی ص ٦۱ تا ۷۷ ؛ رسائل ۱۲٦ نامکمل ؛ مخطوطه رقم ۳۳۵ : ٤۳ ؛ ذخیرۂ فرنگی محل ص ۲۰۲ تا ۲۰۳ .

(۲) فتاوی ص ۷۷ تا ۸۷ ؛ ذخیرۂ فرنگی محل ، مخطوطه رقم ۹۰ : ٤۹ .

طیبغا الحنفی نے شیخ جلال‌الدین القبانی کے منظومے کی مندرجہ ذیل عبارت قاسم کے پاس بغرض تحقیق بھیجی :

« و فی صیام الست من شوال　　　کراهة عند اولی الأفضال

و قوله فی شرحها : ای یکره صوم الست من شوال متتابعا و متفرقا عند ابی حنیفة وعن ابی یوسف یکره متتابعا لامتفرقا وقال مالک یکره علی کل‌حال و هذا وظیفة الجهال و کل حدیث فیه فهو موضوع ذکره فی‌کتاب التفسیر وصوم شهر رمضان نسخ کل صوم کان قبله والاضحیة نسخت کل دم کان قبلها وقیل لایکره وهو قول محمد و الاول اصح لمافیه من التشبه بأهل الکتاب لانهم یلحقون الفرض مالیس منه. انتهی بحروفه »

قاسم نے بتایا کہ یہ سب محض غلط ہے . « عند ابی حنیفة » والی عبارت «المحیط الکبیر» سے منسوب کی جاتی ہے مگر «محیط برهانی» اور «ذخیرۂ برهانیه» میں یہ عبارت اس انداز سے ملتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خلاف اصول ہے اور «ذخیرہ» میں اس پر یہ تعقیب ملتی ہے کہ اس کا الٹا صحیح ہے اور «محیط» میں بھی ایسا ہی ہے . امام ابو یوسف کی طرف جو چیز منسوب کی گئی ہے وہ « نقل مختل » ہے . کتب فقہیہ کی عبارت متفقہ طور پر یہ ہے کہ ابو یوسف سے کرخی کے الفاظ میں اس طرح منقول ہے کہ «کانوا یکرهون» ان یتبعوا رمضان صیاماً خوفا ان یلحق ذلک الفریضة » اس عبارت سے صاحب حقایق نے یہ مطلب سمجھا کہ تتابع مکروہ ہے اور اس کی تاویل کی . صاحب بدایع کے نزدیک مکروہ ہونے کی صورت یہ ہے کہ ایک روزہ عید کے دن اور پانچ اس کے بعد رکھے. یہ مطلب حسن بن زیاد لؤلؤی کے املا سے لیا گیا اور یہ کہنا ضعیف و ماؤل روایت پر اعتماد کرنا ہے .

اس کے بعد قاسم نے امام ابو حنیفہ کے اصحاب سے لے کر اپنے مشایخ تک کی حنفیہ کی معتمد علیہ روایات پیش کی ہیں چنانچہ امام محمد، حسن بن زیاد، طحاوی، ابوالليث سمرقندی صاحب «نوازل»، الحسام الشهید صاحب

«واقعات» ابو جعفر عمر النسفی، صاحب «هدایه» و «تجنیس» قاضی خاں، صاحب «الحقایق» امام الزوری السدیدی، صاحب «ینابیع» ابوبکر اسماعیلی امام محمد بن حامد، صاحب «المنتقی»، صاحب «کافی»، «وافی و مصفی»، صاحب «مجمع البحرین» صاحب «غایة» اکمل الدین بابرتی سب کو حوالے میں پیش کیاهے پھر «وظیفة الجهال» پر تنقید کرتے هوئے احادیث و آثار سے مذکورہ بالا روزوں کی افضلیت و استحباب پر دلائل قائم کیے هیں.

۱۱۳—القول المتبع فی الکنائس والبیع[1]: قاسم سے مصر کے کلیساؤں اور یہودیوں کے معبدوں کے بارے میں دریافت کیا گیا تھا کہ ان کا کیا حکم هے. قاسم نے بتایا کہ حکم کی بنیاد یہ امر هے کہ مصر مسلمانوں کے زیرنگیں کس طرح آیا: عنوةً یا صلحاً. اس کے بعد فقہائے مذاهب اربعہ کی آراء کو پیش کیاهے اور ان میں باهم جو اختلافات هیں ان کی وضاحت کی هے. فقہاء حنفیہ اس پر متفق هیں کہ مصر عنوة فتح هوا. مالکیہ کی رائے میں مصر ارض وقف هے. شافعیہ میں اس بات میں کہ عنوة فتح هوا یا صلحاً باهم اختلاف هے. قاسم بتاتے هیں کہ قول را جح شوافع کا یہی هے کہ عنوة فتح هوا. حنابلہ بھی یہی کہتے هیں کہ عنوة فتح هوا. هر ایک مذهب جن روایات سے استدلال کرتا هے انھیں پوری تفصیل سے پیش کیا هے پھر اس نتیجے پر پہنچے هیں کہ «وحاصله ان الصحیح العنوة». اس کے بعد اس فقہی دعوے کو تاریخ سے ثابت کیا هے اور تفصیلی طور پر مستند مآخذ سے فتح مصر کے حالات بیان کیے هیں. اس میں اسکندریۂ برقہ، طرابلس وغیرہ سب کی فتح کے حالات آگئے هیں. اس کے بعد یہ بتایا هے کہ عنوة فتح هو تو اس کے کیا احکامات هیں اور صلحاً هو تو کیا هیں اور ان دونوں صورتوں میں غیر مذاهب کی عبادت گاهوں کے احکام میں جو فرق هوجاتا هے اس کا ذکر کیا هے. اس سیلسلے میں فقہائے اربعہ کے مسالک کا مفصل ذکر کیا هے.

---

(۱) الضوء ٦ : ۱۸۷؛ اسماء ۱ : ۸۳۱؛ کشف : ۱۳٦٤؛ چسٹربیٹی : ۳۷۷٤؛ فتاوی ص ۲٦۸ تا ۳۲۱.

۱۲٤ــاحکام الشہادۃ و التزکیۃ[1] : ایک مالکی المذہب قاضی کے سامنے ایک آدمی پر شہادت دی گئی جس سے اس کی تکفیر لازم آتی تھی. قاضی مشہود علیہ کو قتل کرنا چاہتا تھا مگر تعدیل و تزکیۂ مشہود اس کے لیے دشوار تھا چنانچہ اس نے یہ کیا کہ ایک حنفی قاضی کے پاس گواہوں کو تزکیہ و تعدیل کے لیے بھیج دیا کہ وہ تزکیہ کرکے مطالع کرے. یہ معاملہ قاسم کے علم میں لایا گیا قاسم نے کہا کہ مالکی قاضی کی یہ حرکت تحامل خفی کی علامت ہے اور حنفی قاضی نے فتوی اور عمل دونوں میں غلطی کی ہے چنانچہ تفصیل کے ساتھ تزکیہ شہود پر بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ ترکیہ کا صحیح طریقہ کیا ہے. تزکیہ بالسر کسے کہتے ہیں تزکیہ بالعلانیۃ کیا ہوتا ہے، کس کی شہادت قبول ہوگی اور کس کی نہیں.

۱۱۵ــاحکام الأشربۃ و طبخ العصیر[2] : اسکندریہ سے ایک استفتاء اشربہ اور طبخ العصیر کی اقسام، کیفیات اور احکام کے بارے میں آیا یہ اس کا جواب ہے. ابو عبد اللہ محمد بن رمضان کی «الینابیع شرح مختصر القدوری» کے حوالے سے قاسم نے بتایا کہ أشربہ کی آٹھ قسمیں ہیں: خمر، سکر، نقیع الزبیب، نبیذ التمر، الفضیح، البادق، الطلاء، اور الجمرودی، پھر تفصیل سے ان کے بنانے کے طریقے اور احکام بتائے ہیں اور یہ بھی بتایا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کی حرمت کے فقہی مدارج کیا ہیں اور کس کی حرمت سے انکار پر تکفیر لازم آتی ہے اور کس سے نہیں. اس کے بعد حسام الدین شہید کی نہایت تفصیلی بحث طبخ العصیر کے موضوع پر بتمامہا نقل کی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ طبخ العصیر کے مسایل کے علم کے لیے چھ جزیں ضروری ہیں : اولہا : القدر التی یطبخ فیہا العصیر ؛ و ثانیہا : کیفیۃ الطبخ ؛ و ثالثہا : العمل فیہ بالحساب ؛ و رابعہا : المقادیر التی یحتاج الیہا ؛ و خامسہا : اقسام المسائل التی یقع العمل فیہا الحساب ؛ وسادسہا : الاصل الذی علیہ یدور تخریج المسائل.

(۱) فتاوی ص ۱۱۷ تا ۱۵۱ ؛ مجموعہ ص ۳۸ ناقص الاول.
(۲) فتاوی ۱۵۱ تا ۱٦۸.

۱۱٦ ـــ الدین المشترک[1] : قدوری کی کتاب الصلح کی ایک عبارت «الا ان یضمن له شریکه ربع الدین» کی تشریح اور صلح کی تفصیلی فروعات پر یه رساله هے ۔

۱۱۷ ـــ رسالة فی القراءات الغیر المشهورة[2] : کسی نے بعض غیر مشهور قراءتیں پیش کر کے دریافت کیا که اگر ان قراءتوں کے مطابق نماز میں قران مجید پڑھا جائے تو نماز هوجائے گی یا نهیں قاسم نے بتایا هے که ان قراءتوں کا قاری ابو عبد الله محمد بن السمنفع الیمانی هے جو معروف آدمی هے ۔ بعض لوگوں نے اسے قراء مکیین میں سے بتایا هے ۔ اس کی قراءت پر کچھ لوگوں نے پڑھا بھی هے ۔ لیکن اس قراءت کی سند صحیح نهیں هے کیونکه اگر چه اس کی قراءت کے طرق محمود البصری ، محبوب بن حسن العلائی اور عبدالوهاب الخفاف هیں مگر اس کا مدار اسمعیل بن مسلم المکی پر هے جو غیر معروف هے اور ایسا هونا شذوذ کی دلیل هے ۔ شاذ قراءت سے «کافی» کے مطابق نماز فاسد نهیں هوتی ۔

۱۱۸ ـــ رسالة فی القراءات العشر[3] : قراءات عشر کے بارے میں قاسم سے پوچھا گیا که یه متواتر هیں یا نهیں ۔ قاسم کی تحقیق یه هے که اگرچه مشهور یه هے کهیه قراءتیں متواتر هیں مگر صحیح یه هے که یه مشهور هیں ۔ قاسم نے اس نکته کی طرف توجه دلائی هے که مقروء الأیمة تو متواتر هے مگر ان کی قراءتیں مشهور هیں ۔ قراءات عشره کو متواتر سمجھنا غلط فهمی اور خلط مبحث هے ۔ پھر بتایا که « مرشد و جیز » میں هے که یه دسوں قراءتیں بطریق احاد نقل هوئی هیں مگر قاسم کو اس سے اتفاق نهیں چنانچه ان کے مشهور هونے پر دلائل قائم کر کے اپنے دعوے کو ثابت کیا هے اور طریق اداث بھی بتائے هیں ۔ شاذ قراءتوں سے نماز هوتی هے یا نهیں هے اس بارے میں فقهاء کے مذاهب کی تفصیل بھی پیش کی هے ۔

---

(۱) فتاوی : ۱٦۸ تا ۱۸۰ ۔

(۲) فتاوی : ۱۹۲ تا ۱۹۵ ۔

(۳) فتاوی : ۱۹٦ تا ۲۰۷ ؛ زرکلی : الأعلام ؛ رسائل ۹۹ تا ۱۱٤ ۔

۱۱۹ـــاجارة الوقف[1] : قاسم کے پاس وقف کے بارے میں ایک سوال آیا جس کی عبارت یہ تھی :

« رجل استاجر وقفا من ناظر شرعی ثم ان الموجر عزل وتولی ناظر آخر فادعی علی المستاجر ان الاجارة بدون اجر المثل واجاب المستاجر بانه اثبت اجارته علی حاکم حنفی وان من مذهبه ان الاجارة فی مثله اذا کانت بدون اجر المثل علی الناظر تمام اجر المثل وسئل الحاکم من ذلک »

اور معلوم کیا گیا کہ اس اجارہ وقف کی شرعی حیثیت کیا ہے . قاسم نے جو جواب دیا اس کا ماحصل یہ تھا :

« ان الثبوت المذکور ان کان عن دعوی شرعیة من خصم واستوفت الشرایط و تعرض الحاکم فی الثبوت علیه ان المسمی باجر المثل ولا منازعة للناظر الثانی ، الا اذا ازدادت الرغبات فی العین الموقوفة و صار المسمی دون اجر المثل فحینئذ للقاضی ان یفسخ الاجارة و یجددها باجرالمثل ، إما من المستاجر الاول او من غیره من الراغبین بشرط ؛ وان کان الثبوت المذکور انما هو ایصال جریان العقد بالقاضی فللناظر الثانی مطالبة المستاجر بتمام اجر المثل للمدة التی کانت العین فی یده فیها و فسخ الاجارة واعادها باجرالمثل .

و قول القاضی ان مذهبه ذلک لوصح کان فتوی لا حکما »

پھر قاضی کے قیاس میں غلطی کی نشاندهی کی ہے . قاسم کو بعد میں معلوم ہوا کہ شہر کے بعض علماء قاضی کی موافقت میں رائے رکھتے ہیں اور بعض یہ کہتے ہیں کہ اس مسئلے میں تین روایات ہیں چنانچہ قاسم نے مزید تحقیق کرکے یہ رسالہ تیار کردیا .

۱۲۰ـــتضمین ما ضاع عند الشریک من المال المشترک[2]: قاسم کے

(۱) فتاوی ص ۲۰۹ تا ۲۱۷ ؛ رسائل ص ٦٠ تا ٦٤ ؛ مجموعه ص ۵۲ الف تا ۵۳ ب . غالباً یه وهی رساله هے جس کا نام « دفع المضرات من الأوقاف و الخیرات » هے : کشف ۷۵۷ ؛ اسماء ا : ۸۳۰

(۲) فتاوی ص ۲۱۹ تا ۲۳٤ .

پاس ایک استفتاء آیا جس کی عبارت یہ تھی:

«رجل اشتری نصف فرس من شریکه و تسلم و انتفع بها برکوبها باذن شریکه ثم بعد مدة نهبت؛ فهل یقال لایضمن حصة شریکه لکون ید الشریک ید امانة، ام یقال یضمن لانه مستعیر فان حد العاریة و هو اباحة الانتفاع بمال الغیر بغیر عوض صادق علیه والعاریة مضمونة إلا فیما استثنی ولیس النهب فیما استثنی، فیجاب عن قولهم ید الشریک امانة فانه قول محمول علی الشرکة العاریة عن الانتفاع بغیر عوض جمعا بین هذا و بین ما اقتضاه کلامهم انها عاریة»

اس استفتاء پر حسب ذیل جوابات موجود تھے:

۱—محمدالأندلسی المالکی: «مذهب مالک کے موافق بالاتفاق ضمان نہیں (مع دلیل). اصول حنفیہ کے مطابق بھی اس پر ضمان نہیں (مع دلیل). مذهب شافعی کی رو سے صحیح یہی ہے کہ شریک، مذکور پر ضمان نہیں (مع دلیل). یہ کہنا صحیح نہیں کہ یہ عاریت ہے اس کے دلائل دیے گئے تھے اور بتایا گیا تھا کہ یہ مسئلہ باب عاریت سے نہیں باب قسمة المنافع سے متعلق ہے».

۲—ابن قاضی شہبة الشافعی: اس پر ضمان ہے (مع دلیل)

۳—عمر الحمصی الشافعی: ضمان ہے (مع دلیل).

٤—محمد بن زهرة الشافعی: ضمان نہیں ہے (مع دلیل).

قاسم نے اپنا جواب اس تعریض سے شروع کیا:

«إن السؤال لمتفقه، والأجوبة أجوبة أعیان من ینسب إلیهم العلم. و فی کل منها بحث، أحببت أن أذکر ذلک لیعلم أن بعض من حصلت لهم الشهرة لم یطابق فهمه الخبر»:

سوال کا انداز بتاتا ہے کہ سائل خود فقہ کے علم کا دعوی رکھتا ہے اس لیے قاسم نے پہلے تو سوال کے ایک ایک جزء پر تفصیلی بحث کی اور اس کی غلطیاں واضح کیں پھر جوابوں پر تنقید کی. سائل پر

تنقید کرتے ہوئے قاسم لکھتے ہیں کہ سب سے بڑی غلطی جو سائل سے ہوئی ہے وہ یہ کہ «ید الشریک فیما نحن فیہ» جسے سائل ید امانت سمجھتا ہے وہ کسی فقیہ اہل علم کے نزدیک ید امانت نہیں ہے۔ یہ صورت تو شرکت اموال کی اس صورت میں ہوتی ہے جسے شرکۃ العقود کہا جاتا ہے مثلاً مفاوضہ اور عنان وغیرہ اور جو صورت زیر بحث ہے وہ شرکت املاک و شرکت عین کی ہے جس کے بارے میں اجماع ہے کہ ہر ایک اپنے شریک کے حصے میں اجنبی ہوتا ہے۔ سائل نے جو تعریف عاریت کی دی ہے قاسم نے اس میں بھی متعدد غلطیوں کی نشان دہی کی ہے اور بتایا ہے کہ یہ تعریف محض من گھڑت ہے پھر پورے استفتاء پر بحیثیت مجموعی تنقید کی ہے۔ جوابوں پر تنقید کرتے ہوئے قاسم نے پہلے جواب کے بارے میں لکھا ہے «فالأول كلام متدافع بعيد عن التحقيق» کیونکہ مجیب کی اس بات سے کہ «أما على مذهب مالك لاضمان باتفاق لانها ان كانت على وجه الشركة فهى امانة و ان كانت عارية فلا ضمان ايضاً» سے معلوم ہوتا ہے کہ حصر ان دو صورتوں میں سے ایک میں کیا گیا ہے۔ پہلی صورت تو بے معنی ہے کیونکہ اس کا قائل کوئی نہیں۔ وجہ یہ کہ زیر بحث اشتراک میں ایک شریک دوسرے شریک کے حصے پر قابض ہوتا ہے۔ اصول حنفیہ کے مطابق جو جواب دیا گیا ہے وہ بھی غلط ہے کیونکہ اسے باب عاریت کے علاوہ دوسرے باب سے بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ کہنا کہ مذہب شافعی کے مطابق شریک مذکور پر ضمان نہیں کیونکہ وہ امین ہے یہ بھی غلط ہے۔ ائمۂ شوافع میں سے کوئی اس کا قائل نہیں کہ اگر کسی نے سواری یا مکان کا ایک حصہ خریدا تو اس کا ید اس کے شریک کے ید کے مانند ہے اس کے برخلاف وہ یہ صراحت کرتے ہیں کہ ہر ایک اپنے شریک کے حصے میں اجنبی ہے پھر لکھتے ہیں: «و أما بعد الإذن فى الاستعمال فالكلام فيه بل هو عارية اولا فاين هذا من ذاك» مجیب کے اس قول سے کہ یہ باب قسمة المنافع ہے قاسم نے خود ان کے جوابات مذکورہ کی تردید کی ہے اور دونوں

کو متناقض بتایا ہے۔ مجیب ثانی نے سائل کے احتمال ثانی کو صواب بتایا تھا کہ ید شریک ید امانت اس وقت سمجھا جاتا ہے جب معاملہ عاریت کا نہ ہو، شریک تو غاصب بھی ہوسکتا ہے تو اسے ضمان سے کیسے بری کیا جاسکتا ہے۔ قاسم اس احتمال ثانی کی تصویب پر وہی تنقید کرتے ہوئے جو سائل پر کی تھی، ید شریک کو ید امانت سمجھ بیٹھنے کی غلط فہمی کا ماتم کرتے ہوئے لکھتے ہیں «وهذه وهلة وقع فيها السائل، و يقعه المجيبون بلا تأمل» اور جواب کے ہر جزء پر تنقید کرنے کے بعد جواب کے بارے میں لکھ دیتے ہیں «و ما اشبه هذا بكلام النائم، والله أعلم بما تكن السرائر» جواب ثالث پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس جواب میں عاریت کی اس تعریف کو تسلیم کرلیا گیا ہے جو سائل نے اپنی طرف سے پیش کردی ہے حالانکہ وہ تعریف صحیح بھی نہیں چہ جائیکہ اسے حد قرار دیا جائے «و انه شامل لغير العارية و انه ليس بشامل كهذا على مقتضى العرف».

جواب رابع کے بارے میں بتایا ہے کہ تطویل لا طائل ہے اور اس چیز کا ذکر تک غائب ہے جس سے ایسی صورت میں حکم تبدیل ہوتا ہے «وقد علم ان السائل باحث و بقى عليه ما أخذناه من اشتراط العلف فى نفس الإنتفاع صريحاً أو عرفاً و به تبدل الحكم والعجب كيف خفى عليهم هذا». قاسم نے اپنا فیصلہ ان الفاظ میں دیا ہے: «انه لا ضمان على الشريك على مذهب الحنفية والمالكية و الشافعية إذا ذكر العلف بلانزاع و إن لم يذكر و اعتبر العرف فلا ضمان أيضاً ولا ضمان على مذهب الحنابلة ايضاً (بحوالة كتاب الفروع لابن مفلح الحنبلى)».

۱۲۱ــــرسالة فى انكار القاضى قضاؤه[1]: اگر دو گواہ اس بات کی گواہی دیں کہ قاضی نے فلاں معاملہ میں فلاں شخص کے حق میں اور فلاں کے خلاف فیصلہ دیا ہے اور قاضی اس کے بارے میں کہے کہ میں نے اس طرح کا کوئی فیصلہ نہیں دیا تو اس پر عمل ہوگا یا نہیں اور حکم کا

(۱) فتاوی: ۸۷ تا ۹۶

نفاذ ہوگا یا نہیں ، قاسم نے اس پر اپنی رائے کا اظہار کیا . محی الدین الکافیجی جو قاسم کے مشہور حنفی معاصر تھے اور جن سے قاسم سے چشمک رہتی تھی انہوں نے اس پر کچھ اعتراضات کیے . قاسم نے اس مسئلہ پر مفصل بحث کرکے اپنے نقطۂ نظر کو ثابت کیا ہے .

۱۲۲—رسالة فی قضاء القاضی (بخلاف مذهبه و بخلاف الکتاب او السنة او الإجماع[1]) : مذاہب اربعہ کے اچھی طرح پھیل جانے اور ان پر عمل عام ہوجانے اور کسی ایک مذہب کی تقلید ضروری سمجھے جانے کے بعد قاضیوں کے فیصلوں کے سلسلے میں یہ مسئلہ بڑی اہمیت اختیار کر گیا تھا، خصوصاً مملوک دور کے مصر میں جہاں ہر مذہب کے لیے علیحدہ قاضی اور قاضی القضاة، ہوتے تھے، کہ اگر کسی خاص مذہب فقہی کا قاضی اس مذہب کے خلاف فیصلہ دے دے تو اس فیصلے کی قانونی حیثیت کیا ہوگی اور اس کے نفاذ کے بارے میں کیا رویہ اختیار کیا جائے گا یا کسی مجتہد فیہ مسئلہ میں اپنے اجتہاد کے مطابق فیصلہ دے تو اس کا نفاذ ہوگا یا نہیں قاسم نے فقہ کی امہات کتب کے تفصیلی حوالوں کے ساتھ اس مسئلہ پر بڑی سیر حاصل بحث کی ہے اس پر جو تفریعات ہوتی ہیں ان کا ذکر کیا ہے اور مثالوں کے ذریعے وضاحت کی ہے .

۱۲۳—إجارة المقاطع التی اقطعها الإمام[2] : شہر غزہ سے ایک سوال اس مضمون کا قاسم کے پاس آیا کہ کیا کسی فوجی کے لیے یہ جائز ہے کہ بیت المال کی زمین، جو حاکم اعلی (الإمام الاعظم) کی طرف سے اسے بطور قطیعہ کے ملی ہے ، اجارے پر اٹھادے یا اس وجہ سے ناجائز ہے کہ اثنائے مدت اجارہ میں امام کسی وقت اسے اس فوجی کے ہاتھ سے واپس لے سکتا ہے جس کی وجہ سے اجارے کی پوری مدت کے لیے اس زمین کی مسلسل تسلیم پر اسے قابو نہیں رہتا اور اس وجہ سے بھی

---

(۱) فتاوی : ۲۲٤ تا ۲۳٦ ؛ فتاوی : ۳۳۸ تا ۳٦۹ .

(۲) کشف : اجارة الاقطاع ؛ اسماء ۱ : ۸۳۰ کما فی کشف ؛ چسٹر بیٹی : ۳۲۰۲ : اجارات الاقطاع ؛ فتاوی ص ٤۰۸ تا ٤۱۱ .

کہ یہ ملک منفعت ہے اور کسی مال کے عوض میں نہیں ہے۔ اور اس معاملے میں فوجی کیا اس مستاجر کے مانند ہے جسے خود اجارے پر دینے کا حق ہوتا ہے یا مستعیر کے مانند جسے اجارے پر دینے کا حق نہیں ہوتا۔ اگر اجارے پر دینا اس صورت میں جائز ہے تو موجر کے مرنے یا امام کے زمین کو اس کے قبضے سے نکال کر دوسرے کو دے دینے سے اجارہ فسخ ہوجائے گا یا نہیں اور اگر فسخ نہیں ہوگا تو اجر مثل کے عوض باقی رہے گا یا اس اجر کے عوض جو موجر اول نے مقرر کیا تھا۔ قاسم کا جواب یہ تھا کہ اسے اس زمین کو اجارے پر دینے کا حق حاصل ہے۔ امام کے زمین کو واپس لے سکنے کا کوئی اثر اس پر نہیں پڑتا اور یہ اس سے کہ اجارے کی مدت کے اندر موجر کا انتقال بھی ہوسکتا ہے اور یہ ملک منفعت ہونے کا۔ اس کے دلائل اور نظیریں پیش کی ہیں موجر کے مرنے اور امام کے واپس لے لینے سے اجارہ فسخ ہوجائے گا کیونکہ ملکیت غیر الموجر کی طرف منتقل ہوگئی۔ بعض حنفی فقہاء نے یہ کہا تھا کہ ان دونوں صورتوں میں اجارہ فسخ نہ ہوگا قاسم نے اس کی تردید کی ہے۔

۱۲٤ ــ فی مسائل الوقف[۱]: وقف کے مختلف مسائل کے بارے میں ہے۔

۱۲۵ ــ مایصیر الکافر بہ مسلما[۲]: ایک سامری کے بارے میں قاسم سے دریافت کیا گیا کہ اس نے برضا و رغبت بلا کسی اکراہ و جبر کے اپنے اختیار سے کلمۂ شہادت پڑھا پھر اس کے بعد اپنے دین پر قائم رہا، حاکم حنفی کے سامنے یہ بات ثابت ہوئی مگر وہ یہ کہتا ہے کہ میرے اوپر جبر کیا گیا تھا اسے اس کے دین پر قائم رہنے دیا جائے یا یہ سمجھا جائے کہ وہ شخص مسلمان ہوچکا تھا اور بعد میں ارتداد کا مرتکب ہوا۔ اس مسئلے میں بعض ایسی پیچیدگیاں ہیں جن کے بارے میں قاسم کا کہنا تھا «فقد غلط فیہ بعض الاکابر من قضاتھا» قاسم نے ان غلطیوں کی

---

(۱) فتاوی : ۱۸۸ تا ۱۹۲

(۲) فتاوی : ۲٤۱ تا ۲۵٤

نشان دہی کر کے مسئلے کو منقح کیا ہے ۔ قاسم کا کہنا ہے کہ عام طور سے مسلمانوں میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ کلمۂ شہادت ادا کردینے سے ایک شخص مسلمان ہوجاتا ہے لیکن یہ بات اپنے اندر بعض استثناءات رکھتی ہے ۔ مثلاً یہودیوں کے بعض فرقے ایسے ہیں جو اس بات کے قائل ہیں کہ نبی کریم علیہ الصوۃ والسلام رسول خدا ہیں مگر ان کی رسالت صرف عربوں کے ساتھ خاص ہے سارے جہان کے لیے نہیں ہے ۔ قاسم بتاتے ہیں کہ ایسے شخص کو محض کلمۂ شہادت ادا کردینے سے مسلمان نہیں کہا جاسکتا ۔ تا آنکہ وہ حضور کی رسالت عامہ کا قایل ہو اور پچھلی ساری شریعتوں کو شریعت اسلامیہ کا ناسخ ، اور ہر ایک کے لیے حضور کے لائے ہوئے پیغام کی پیروی کو ضروری سمجھتا ہو ۔

۱۲۶ــ فتوی فی شخص بیدہ حصة من عقار ثمت ملکه لواسة ۸۵۱ھ وادعی آخر انها له صحة من ۸۴۷ھ[1] : محمد بن سلیمان الکافیجی الحنفی نے یہ فتوی دیا تھا کہ کیونکہ دعوی کی بینہ ملکیت کے حکم کی دلیل سے متاخر ہے اس لیے متاخر ناسخ ہوگی اور یہ بھی بتایا کہ اس سے نقض حکم لازم نہیں آتا ۔ قاسم کے پاس بھی یہ فتوی تصدیق کے لیے آیا تھا ۔ قاسم نے اس جواب پر سخت اعتراض کیے اور کہا کہ فتوی عدم مراجعت کتب فقھیہ کی وجہ سے سراسر غلط ہے ۔ مجیب نے سائل کے صحیفے کو دنیا میں اور اپنے صحیفے کو آخرت میں سیاہ کیا ہے ۔ پھر مسئلے کی تحقیق کی ہے اور «مختصر» الحاکم الشهید اور «محیط» کے حوالوں سے اپنے موقف کو مدلل کیا ہے ۔ بالکل اسی طرح کا ایک فتوی یحیی بن محمد الاقصرائی الحنفی نے دیا تھا اور بتایا تھا کہ بینة واضع الید پر عمل کیا جائے گا نہ کہ «بینة من بیدہ کتاب الملک» پر ۔ قاسم نے اس پر اعتراض کیا اور بتایا کہ اس کے برخلاف صحیح ہے ۔ کافیجی پر اعتراض کرتے ہوئے قاسم نے قاضی خاں کے حوالے سے بتایا کہ رسم المفتی یعنی فتوی دینے کا اصول و دستور یہ ہے کہ اگر مسئلہ مسئول عنہا ظاہر الروایات میں سے

---

(۱) مجموعہ : ۴۰ ب تا ۴۲ الف

ہے اور اصحاب میں اس کے بارے میں اختلاف نہیں تو مفتی اگر مجتہد متفنن بھی ہے تب بھی ظاہرالروایات کے مطابق فتوی دے۔ قاسم کا بجا طور پر کہنا ہے کہ سائل تمہاری ذاتی رائے نہیں پوچھتا وہ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کی رائے معلوم کرتا ہے۔ اسی کے مطابق جواب دو۔

۱۲۷ــرسالة فی الطلاق الرجعی[1] : ایک عورت کو طلاق رجعی دی گئی اور اس پر تین ماہ تیرہ دن گزر گئے اور شوہر کا انتقال ہوگیا۔ عورت نے اقرار کیا کہ اس دوران اسے تین حیض آچکے ہیں اور اس کی عدت شوہر کی موت سے پانچ دن پہلے ختم ہوگئی۔ مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ اس اقرار کے بعد اسے وراثت ملےگی یا نہیں۔ اس صورت میں کسی مفتی نے عبداللطیف بن فرشتہ کی «شرح مجمع البحرین» کے حوالے سے بتایا تھا کہ اسے وراثت ملےگی۔ قاسم نے بتایا غلط ہے اسے وراثت نہیں ملےگی۔ اس پر اعتراض کیا گیا تو کرخی الفتاوی الصغری لحسام الدین، التتمة، المنیة، قاضی خاں، شرح ہدایہ، شرح کنز، المحیط، البدایع، الذخیرہ، اور فصول عمادیة کے حوالوں سے قاسم نے اپنے جواب کو مدلل کیا۔

۱۲۸ــتعلیق الطلاق بالنکاح[2] : حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر کوئی مرد کسی عورت سے کہے کہ اگر میں تجھ سے نکاح کروں تو تجھے طلاق ہے یا جس عورت سے نکاح کروں اس کو طلاق، تو نکاح کے فوراً بعد طلاق واقع ہوگی۔ قاسم نے اس مسئلے کی تشریح کی ہے۔ ائمہ فقہ کے جو اختلافات ہیں ان کی تفصیل کی ہے اور اخبار و آثار جن سے وہ استدلال کرتے ہیں، پیش کیے ہیں۔ مذکورہ بالا صورت میں نکاح کی وہ صورت جس میں طلاق واقع نہ ہو کیا ہوسکتی ہے یہ بھی

---

(۱) مجموعہ : ۴۲ ب تا ۴۴ الف : رسائل ص ۲۱ تا ۲۴؛ فتاوی ص ۳۹۰، تا ۳۹۴، ص ۹۶ تا ۱۰۰، یہاں اس کا نام حاشیہ میں «فی العدة وطلاق المریض» دیا ہوا ہے۔

(۲) فتاوی ص ۳۶۹ تا ۳۹۰؛ رسائل ص ۴۰ تا ۶۰؛ مجموعہ ص۴۷ ب تا ۵۲ الف۔

بتایا ہے قضا اور فتوی میں ائمۂ ثلاثہ کے نزدیک کیا فرق ہے اور وہ ان دونوں کی حقیقت کیا قرار دیتے ہیں اس پر بھی گفتگو کی ہے .

۱۲۹۔مسئلۃ لبس الأحمر[1] : سرخ رنگ کا کپڑا پہننا مردوں کو جائز ہے یا مکروہ ہے . مکروہ ہے تو تحریمی یا تنزیہی مکروہ ہونے کی صورت میں نماز درست ہوگی یا نہیں . قاسم نے احادیث و آثار کی روشنی میں ان مسائل پر گفتگو کی ہے اور دلائل پیش کیے ہیں . قاسم کا مسلک اس بارے میں یہ ہے «مکروہ تحریماً تصح الصلوة مع الکراھة» .

۱۳۰۔ردالقول الخائب فی القضاء علی الغائب[2]: کسی حنفی فقیہ نے قاسم کے سامنے یہ بات کہی کہ آج کل اگر کوئی حنفی قاضی کسی کی عدم موجودگی میں اس کے خلاف فیصلہ دے دیتا ہے تو وہ نافذ ہوگا. قاسم نے کہا اس دعوے کی صحت ہمیں تسلیم نہیں. اس فقیہ نے کہا تمہاری بات ایک روایت کے مطابق ہے اور اصح الروایتین کے موافق نفاذ ہوگا اور اس کے بعد «ھدایہ» اور استروشنی کی «فصول» کے حوالے سے بتایا کہ یہ معاملہ مجتہدفیہ ہے. مزید برآں اپنے دعوے پر «شارح ھدایہ قوام الدین الاتقانی عن الحاکم الشھید، خلاصة الفتاوی عن الامام السرخسی الزیادات، جامع الفتاوی، الفتاوی الظھیریة، الفصول عن المحیط والصغری کو ثبوت میں پیش کیا. قاسم نے اس پر کہا کہ «ھذہ کلام من لم یحصل علم المسئلة، و لا علم مراد الاصحاب بالقاضی، ولا مدلولات الفاظھم، ولا محل نزاع» وجہ یہ بتائی کہ اس مسئلہ میں دو اختلافات ہیں: ایک وہ اختلاف جو ائمۂ مجتہدین کے درمیان ہے، اور دوسرا وہ جو مشائخ احناف کے درمیان ہے. وہ اختلاف جو ائمہ کے درمیان ہے وہ اس کے جواز کے بارے

(۱) رسائل ص ۹۵ تا ۹۹ .

(۲) رسائل ص ۱۱۹ تا ۱۲۲ ؛ کشف ۸۳۷ ؛ اسماء ۱ : ۸۳۰ ؛ سراج الدین عمر بن رسلان الشافعی البلقینی (م ۸۰۵ ھ) کی ایک کتاب اسی مسئلہ پر بنام «القول الصائب فی جواز القضاء علی الغائب» ہے . کشف ۱۳٦٤

میں ہے ۔ ہمارے ائمہ کا قول یہ ہے کہ قضاء علی الغائب جب قصداً ہو باطل ہے ۔ دوسروں نے اسے جائز بتایا ہے ۔ اس پر یہ اختلاف متفرع ہوتا ہے کہ وہ قاضی مجتہد جسے قضا کی ذمہ داری بغیر کسی پابندی کے (مطلقاً) سونپی گئی ہو وہ اپنے اجتہاد سے کام لیتے ہوئے قضاء الغائب پر عمل کرتا ہے تو جائز ہے ۔ مشائخ کے درمیان جو اختلاف ہے وہ غائب پر قضاء کے نفاذ کے بارے میں ہے بشرطیکہ قضا اجتہاد سے صادر ہوئی ہو ۔ بعض کا قول ہے کہ یہ قضاء محل اجتہاد میں ہونے کی وجہ سے نافذ ہوگی اور بعض کہتے ہیں نافذ نہ ہوگی اس کا نفاذ دوسرے قاضی کے امضاء پر منحصر ہے ۔ روایتین سے مراد یہی اختلاف ہے اور یہ مشائخ کا معروف استعمال ہے کہ «قاضی» بول کر «مجتہد» مراد لیتے ہیں اور «فقیہ» سے بھی ۔ اس سب کی دلیل یہ ہے کہ «الاصل» میں امام محمد نے القضاء علی الغائب کو بغیر کسی اختلاف کے ناجائز بتایا ہے ۔ قاسم نے شرح طحاوی ، ہدایہ ، ادب القاضی ، اتقانی عن الحاکم الشہید کی عبارتیں پیش کر کے ثابت کیا کہ قاضی سے مطلب مجتہد ہے ۔ مشایخ کا اختلاف «الفصولین» میں مصرح ملتا ہے کہ قضاء علی الغائب کے نفاذ میں دو روایتیں ہیں ۔ شمس الائمہ سرخسی اور شیخ الاسلام خواہر زادہ نفاذ کے حق میں ہیں ۔ ان کے علاوہ مشائخ عدم نفاذ کے ۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ روایتین کا اطلاق اختلاف مشایخ پر ہوتا ہے ۔ پھر تفصیل سے نفاذ کی وجہ بتائی ہے ۔

١٣١ـــ رفع الاشتباہ عن مسئلۃ المیاہ[1] : پانی کے مسائل پر مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت مفصل گفتگو کی ہے : الفصل الاول فی تعریف الماء المستعمل و فیما یصیر بہ الماء مستعملا و ما لا یصیر بہ مستعملا ؛ الفصل الثانی فی حکم الماء المستعمل و متی یصیر مستعملاً ؛ الخاتمۃ فی بیان حکم ملاقاۃ الماء الطاہر للماء الطہور ۔

(١) کشف : ٩٠٩ «مسیل المیاہ» ؛ اسماء ١ : ٨٣٠ «سبل المیاہ» ؛ بروکلمن ٢ : ٨١ (٩٩) ؛ مجموعہ ص ٩٩ الف ۔

١٣٢ـــقضاء الفوائت[1] : قضاء نمازوں کی ادائیگی اور ترتیب پر ہے، « ہدایہ » کی عبارت کی تشریح کے سلسلے میں .

١٣٣ـــكتاب فتوى فى وقف البنا دون الارض و فى الرهن إذا ضاع من المرتهن[2] : اس وقف کے سلسلے میں قضاء القاضی بخلاف مذہبہ پر نہایت مفصل بحث ملتی ہے .

١٣٤ـــرسالة فى مسئلة الإستبدال[3] : فتوى عن رجل استبدل أرضاً لمقدار معلوم بطريق الوكالة و وضع المستبدل له يده عليه و هدمه و انشأ فيه واستمر على ذلک مدة ثم مات المؤكل ثم الوكيل و أراد المستبدل منه الرجوع بالمبلغ المستبدل به .

١٣٥ـــالعصمة عن الخطأ فى نقض القسمة[4] .

١٣٦ـــموجبات الاحكام فى الفروع[5] : ایسی مرهونه جائداد کی فقہی حیثیت کے بارے میں ہے جیسے راهن نے بعد میں وقف کردیا اور دونوں مرحلوں میں سے پہلے پر حنبلی قاضی نے اور دوسرے پر حنفی قاضی نے فیصلہ دیا .

١٣٧ـــدفع المضرات عن الأوقاف و الخيرات[6] .

١٣٨ـــاعمال فى الوصايا و الدوريات و اخراج المجهولات[7] .

---

(١) ذخیرۂ فرنگی محلؒ ، مخطوطه رقم ٣٣٥ : ٤٣ ، ص ٢٠٣ ب ؛ فتاوى ص ٤٣٦ .

(٢) فتاوى ص ٢٥٤ تا ٢٦٦ ؛ مجموعه ص ٦ ناقص الآخر .

(٣) الضوء ٦ : ١٨٧ ( تخريج الأقوال فى مسئلة الإستبدال) ؛ رسائل ص ٧٠ تا ٧٢ ؛ مجموعه ٥٥ (الف) .

(٤) كشف : ١١٤١ ؛ اسماء ١ : ٨٣١ ؛ بروكلمن ٢ : ٨١ ( ٩٩ ) ؛ مجموعه : ٥٦ (الف) .

(٥) اسماء ١ : ٨٣١ ؛ (مغيبات الاحكام) بروكلمن ٢ : ٨١ . ( ٩٩ ) كشف : ١٨٩٨ رسالے کی نوعیت کشف سے ماخوذ ہے .

(٦) كشف ٧٥٧ ؛ اسماء ١ : ٨٣٠ . دیکھیے اجارة الوقف

(٧) الضوء ٦ ; ١٨٧

١٣٩ـــالتجدات فى السهو عن السجدات[1] .

١٤٠ـــرفع اليدين[2] .

١٤١ـــشرح البسملة[3] .

١٤٢ـــرسالة فى المساقاة[4] : مساقاة کے مسئلے پر قاسم اور دوسرے فقہاء کے جوابات اور قاسم کی تحقیقات مسئلہ مذکورہ کے بارے میں .

١٤٣ـــالقمقمة فى مسئلة الجزء و القمقمه[5]

١٤٤ـــحفر المربعات[6] : ایک شخص نے کچھ مزدور رکھے اور قد آدم سے دوگنے گہرے گڑھے کھدوائے . ایک گڑھے کی دیوار کسی مزدور پر گرپڑی جس سے وہ ہلاک ہوگیا . مسئلہ یہ تھا کہ اس مزدور کی دیت کسی پر آتی ہے یا کسی پر نہیں ، آتی ہے تو کس پر ، مالک پر یا ساتھی مزدوروں پر . اس کی مفصل تحقیق ہے .

١٤٥ـــفى حکم مؤخر الصداق[7] : حنفی قاضی نے مہر مؤجل کو موت یا طلاق تک مؤخر کردیا اور نجم الدین الزاہدی کے اس قول سے کہ خوارزم میں موت یا طلاق تک مہر کو موخر کرنا ان کے نزدیک عادت مالوفہ اور شریعت معروفہ ہے اور فخر الدین زیلعی کے اس قول سے استناد کیا کہ «لیس لہما ان تعورف تاخیرہ الی المیسرة او الی الموت او الطلاق ولو کان حالا لان «المتعارف کالمشروط» قاسم نے بتایا کہ ان دونوں سے سند نہیں پکڑی جاسکتی کیونکہ خوارزم کا عرف مصر و شام کے عرف سے مختلف ہے اور دوسرے قرب و جوار کے اسلامی ممالک کا بھی . اور اپنے مسلک کی وضاحت کی .

---

(١) الضوء ٦ : ١٨٧ ؛ کشف ١٩٣٠ (فى بیان السہو) ؛ اسماء ١ : ٨٣١ ، کما فى کشف .

(٢) الضوء ٦ : ١٨٧

(٣) الضوء ٦ : ١٨٧ والبسملة ؛ أسماء ١ : ٨٣٠

(٤) فتاوى ص ٤٠٨ تا ٤١١ . (٥) اسماء ١ : ٨٣١

(٦) فتاوى ص ٤٠٥ تا ٤٠٨

(٧) فتاوى ص ٢٠٧ تا ٢٠٩ ؛ رسائل ص ١٤٨

## قاسم کے کام کی قدروقیمت :

قاسم کی تصنیفات و تالیفات کے جائزے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اگرچہ قاسم کی نظر سارے ہی متداول علوم و فنون پر تھی تاہم ان کا اصل میدان حدیث اور فقہ کا ہے ۔ حدیث میں قاسم کی مہارت کا اندازہ ان کی تخریجات، رجال پر ان کی تالیفات اور شروح وغیرہ سے بخوبی ہوسکتا ہے ۔ تخریج کے فن میں کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ پورے ذخیرۂ حدیث پر نظر ہو ۔ قاسم نے تخریج کو نہ صرف اپنا موضوع بنایا بلکہ اس فن کے ائمہ کی جو تالیفات اس موضوع پر تھیں ان پر استدراکات اور اضافے بھی کیے ۔ زیلعی اور عراقی فن حدیث میں بڑے وسیع‌النظر ائمہ میں سے ہیں ان کی تخریجات پر استدراک ہر مدعی حدیث کا کام نہیں ، رجال زوائد اور امام محمد و طحاوی کی تصانیف اور امام ابو حنیفہ و شافعی کی، مسانید کے رواۃ کی جمع و ترتیب خود فن رجال کے وسیع مطالعے کو متقاضی ہے ۔ حدیث پر قاسم کے کاموں سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے استاد ابن حجر کے فیض صحبت سے فن حدیث کا اچھا ذوق پیدا کرلیا تھا جسے ان کے وسیع مطالعے نے بڑی گیرائی بخشی تھی ۔ بعض کوتاہ نظروں نے حنفیہ پر علم حدیث کی کمی کا جو الزام لگا رکھا ہے قاسم کی ذات اس کی مجسم اور مؤثر تردید تھی ۔ قاسم کی نظر حدیث کے صرف روایتی پہلو پر ہی نہ تھی وہ احادیث سے مسائل کے استنباط واستخراج کے رموز سے بھی آشنا تھے ۔ امام ابو حنیفہ پر اجلۂ محدثین کی طرف سے کیے جانے والے اعتراضات کو دفع کرنا اسی شخص کا کام ہوسکتا ہے جو حدیث کے روایتی پہلو رجال ، اسانید اور علل حدیث پر پوری نظر رکھتا ہو ، مختلف اور متعارض حدیثوں میں تطبیق و توفیق کے فن سے واقف ہو ، ساتھ ہی موضوع سے متعلق احادیث کے مرکزی خیال کو دریافت کرتے ہوئے استقراء کے ذریعے ان اصول و استثناءات پر پہنچ سکے جو ان کی تہ میں کام کررہے ہیں اور اس طرح فقہی مسائل کو پراگندہ اور منتشر افراد کی صورت میں

دیکھنے کے بجائے ایک مربوط اور باقاعدہ نظام کی شکل میں دیکھ سکتا ہو۔ اس میں شک نہیں کہ قاسم اس اعتبار سے فن حدیث پر بڑی اچھی نظر رکھتے ھیں ۔ انہوں نے محدثین سے خود ان کے میدان میں انہیں کے ہتھیاروں سے مقابلہ کرکے حدیث کے میدان میں امام ابو حنیفہ کی برتری ثابت کی ہے ۔

حدیث کا اصل مقصد یہ ھے کہ انسان کو ابتدائی زندگی میں عقائد اور عمل کے اعتبار سے تفصیلی ھدایت مل سکے ۔ یہ چیز ہمیں فقہ کی طرف متوجہ کرتی ھے جس کی حقیقت انسانی زندگی کے لیے تفصیلی اور عملی رہنمائی کی فراہمی ھے ۔ قاسم کا اصل میدان اور حقیقی کام فقہ ہی ھے ۔ وہ اس میدان کے مانے ہوئے شہسواروں میں سے ھیں ۔ متاخرین حنفیہ میں دوسرے لوگوں کے علاوہ خاص کر ابن الھمام نے اپنی تحریروں کے ذریعے یہ دکھایا کہ فقہ حنفی پر یہ الزام درست نہیں کہ یہ احادیث وآثار سے زیادہ قیاس وغیرہ پر اعتماد کرتا ھے ۔ انہوں نے یہ بتا دیا کہ فقہ حنفی حدیث کے صحیح اور کلی فہم کا براہ راست نتیجہ ھے اور اس طرح فقہ اور حدیث کو دو متخالف رجحانات سمجھنے کے خلاف احتجاج کیا اور ان دونوں دھاروں کو ایک دوسرے میں سمونے کی کوشش کی ۔ قاسم اس معاملے میں اپنے استاد ابن الھمام کے سچے جانشین ھیں ۔ قاسم نے ابن الھمام کی کوششوں کو آگے بڑھایا ۔ انہیں اس کوشش میں جو کامیابی ہوئی اس کا اعتراف مخالف و موافق دونوں کو ھے ۔ قاسم کی فقہی تحقیقات ان کی ان کوششوں اور کامیابی کا بڑا واضح ثبوت پیش کرتی ھیں ۔ قاسم جب کسی فقہی مسئلے پر گفتگو کرتے ھیں تو اس سے متعلق احادیث و آثار اور روایات کے سارے ذخیرے کو پیش کرکے دکھا دیتے ھیں کہ استنباط مسائل میں حنفی مسلک دوسرے مسالک کے مقابلے میں جو توافق حدیث کا دعوی رکھتے ھیں احادیث سے کہیں زیادہ مطابقت و مناسبت رکھنے والا ھے ۔

فقیہ اس وقت تک فقیہ کہلانے کا مستحق نہیں جب تک اسے مسائل

کے بارے میں نہ صرف صحابہ کے اختلافی مسائل، مجتہدین کے اختلافات ان کا مبنی، منشا اور دلائل کا علم ہو بلکہ ساتھ ہی ہر فقہی مذہب کے اصل اور بنیادی مسائل (جسے اصل مذہب کا نام دیا جاتا ہے)، اصحاب مذاہب کے مسائل کی تخریجات، تنقیحات اور تفریعات سے بھی پورے طور پر باخبر ہو۔ یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ جہاں تک ان کے معاصرین کا تعلق ہے۔ بلکہ غلط نہ ہوگا اگر معاصرین کے بجائے متأخرین حنفیہ کہا جائے۔ قاسم اس بارے میں ایک امتیازی شان کے مالک نظر آتے ہیں۔ وہ ایک طرف تو فقہ حنفی کے محقق ہیں اور اس کے اصول و کلیات تفریعات و تخریجات اور اصل مذہب سے باخبر، ساتھ ہی متقدمین و متاخرین کی تصانیف پر پورا عبور رکھتے ہیں۔ ان کے طرز تعبیر کے ادا شناش اور ان کی تحقیقات اور کام سے واقف ہیں بلکہ صحابہ کے اختلافی مسائل اور ان کے دلائل کے علم کے ساتھ باقی مذاہب فقہیۂ ثلاثہ کے مسائل و دلائل پر بھی اچھی نظر رکھتے ہیں بلکہ بعض اوقات دوسرے مذاہب کے اپنے معاصرین سے زیادہ ان کے مسائل اور مذاہب سے واقف معلوم ہوتے ہیں۔ قاسم نے دوسرے مذاہب کا ایسا مطالعہ کیا تھا کہ ان پر تنقید بھی کرسکتے تھے انھوں نے جن دیگر مذاہب کے علماء پر ان کے مذہب کے مسائل کے بارے میں گرفت کی ہے وہ ایک دقیق و عمیق مطالعے کا پتا دیتی ہے۔

قاسم تاریخ فقہ کے اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جب تحقیقی تقلید کی بنیاد پڑ رہی تھی اور فقہی مسائل کو تحقیق کی کسوٹی پر کسا جا رہا تھا۔ قاسم اس دور کے اس رجحان کے بڑے اچھے مظہر ہیں، وہ مقلد ہوتے ہوئے بھی محقق ہیں اور امام ابو حنیفہ کی تقلید پر علی وجہ البصیرت قائم ہیں۔ وہ احادیث و آثار کی روشنی میں فقہ حنفی کے مسائل کو مانتے ہیں۔ اس کے ساتھ وہ اس بات کے سخت مخالف ہیں کہ کوئی مفتی یا فقیہ مستفتی کو اپنی ذاتی رائے سے مسائل بتایا کرے۔

قاسم کے فتاویٰ سے جہاں ایک طرف اس دور کی زندگی کی

جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگ کن باتوں کے بارے میں کس طرح سوچتے تھے اور اپنے قانونی برتاؤ کا رشتہ عملی زندگی سے کس طرح جوڑتے تھے اور کن باتوں کی ان کی نگاہوں میں اہمیت تھی وہاں خود قاسم کے بارے میں معلوم ہوتا ہے کہ فیاض ازل نے انہیں ایک قانونی اور نکتہ رس دماغ بخشا تھا جسے ترتیب اور مطالعے نے جلا دی تھی ۔ وہ مسئلہ زیر بحث کے بنیادی نکات کو فوراً گرفت میں لے لیتے ہیں اور اس اصول کی تحقیق و تنقیح کرتے ہیں جو اس کا مدارعلیہ ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقید میں وزن اور جان محسوس ہوتی ہے ۔

ابن الہمام اگرچہ فقہ حنفی کے پابند ہیں مگر عصبیت کا شکار نہیں ۔ تحقیقی ذوق و رحجان نے انہیں عالی ظرفی اور بلند حوصلگی بخشی تھی ، وہ مخالف کی دلیل کا نہ صرف احترام کرتے ہیں بلکہ اگر معقول اور یقین بخش ہو تو اسے خراج دلی سے تسلیم بھی کرتے ہیں ۔ قاسم نے اپنے استاد سے یہ خراج دلی ، عالی ظرفی اور بلند حوصلگی بھی سیکھی تھی ۔ وہ علمی میدان میں اپنے مخالف کی خوبیوں کا اعتراف کرنے سے گریز نہیں کرتے ۔ وہ خود ابن عربی اور ابن الفارض کے عقیدت‌مند ہیں مگر ان حضرات کے سخت ترین ناقد ابن تیمیہ سے علمی استفادے میں عار نہیں محسوس کرتے اور ابن تیمیہ کو علوم شرعیہ میں ان کا مقام دیتے ہیں ، یہ دوسری بات ہے کہ وہ ابن تیمیہ کو تصوف کا ذوق شناس نہیں سمجھتے اور اس بارے میں ان کے زیادہ قایل نہیں ۔ یہ دلیل ہے قاسم کے علم سے خلوص رکھنے اور برتنے کی ۔

مختصراً ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ قاسم فقہ اور حدیث کا ایک سنگم تھے ان کی ذات میں محدث ابن حجر کا پرتو اور فقیہ ابن الہمام کا جلوہ نظر آتا ہے ۔ علم کی چاکری نے اس مملوک کو وہ رتبہ بخشا کہ وہ نہ صرف اپنی برادری کے لیے باعث فخر و نازش ہیں بلکہ کتنے ہی سر ان کے علم و فضل کے احترام میں خم ہیں ۔

[م ٦٤ / ١١ / ١٥]

# نوائی کے ترکی اشعار

میر علی شیر نوائی (۸۴۴ھ / ۱-۱۴۴۰م — ۹۰۶ھ / ۱۵۰۱م) کی شخصیت بڑی ہمہ گیر تھی. وہ ایک مدبر، مصنف، مصور، اور ماہر موسیقی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بلند پایہ شاعر بھی تھا. اس نے ترکی اور فارسی[1] دونوں زبانوں میں شاعری کی ہے اور بقول پروفیسر براؤن جملہ فن و ادب کی سرپرستی نے اسے ادب ایران کی ہر تاریخ میں تحسین آمیز ذکر کا حقدار بنا دیا ہے[2]. تاہم میر علی شیر نوائی کی ادبی ناموری کا استحقاق ترکی زبان پر مبنی ہے[3]. اس نے ترکی زبان کی شرقی بولی میں شاعری کی ہے جس کو چغتائی (چاغاتائی) بھی کہا جاتا ہے[4]. لیکن اس سے کسی طرح سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ میر علی شیر نوائی نے جنوبی

---

(۱) وہ فارسی میں «فانی» تخلص کرتا تھا.

(۲) E. G. Brown : *A Literary History of Persia*, Vol. III, p 506

(۳) میر علی شیر نوائی کے حالات زندگی اور اس کے آثار کے لیے پروفیسر احمد ذکی ولیدی طوغان کا مضمون دیکھیے جو ترکی دائرہ معارف اسلامیہ (Islam Ansiklopedisi) کی چوتھی جلد میں شائع ہوا ہے. نیز اسی موضوع پر دیکھیے:

(1) A. Samoylovich : *Mir Ali Shir* (Leningrad, 1928); (2) Belin : *Notice biographique et litteraire sur Mir Ali-Chir-Nevali* (Journal Asiatique, Vol. 17); (3) A. A. Semenov : *Materyali bibliograficheskomu ukazatetu pechalnih proizvedeniy Alishira Novyi litteaature onem* (Tashkend, 1940); (4) Ali Nihad Tarlan: *Ali Shir Nevayi* (Istanbul, 1942); (5)—

دیوان امیر نظام الدین علیشیر نوائی فانی : رکن الدین همایون فرخ. (تہران - ۱۳۴۴ شمسی)

(۴) وسط ایشیا کی چغتائی سلطنت کے اندر تیموریوں کے عہد میں ترکی ادب کے درخشاں ارتقا کے زیر اثر مشرقی ترکی ادبی زبان کا نام چغتائی پڑ گیا ہے جو ترکی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے.

ترکوں کی عثمانی ترکی شاعری کی نشو و نما پر بھی گہرا اثر ڈالا ہے۔ ہندستان میں تیموری سلطنت کا بانی ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ بڑی دقت نظر کا مالک تھا اور عام تذکرہ نگاروں کی طرح جا و بیجا ستائش کرنے کا بہت کم عادی۔ اس کے باوجود میر علی شیر نوائی کی شاعری کی تعریف اس نے «بابر نامہ» میں نہایت اعلی الفاظ میں کی ہے[1]۔

میر علی شیر نوائی فارسی زبان کا بھی عالم تھا اور فارسی ادب سے کافی متاثر۔ چنانچہ دوسرے ترکی شعراء کی طرح وہ بھی فارسی شعراء کا مقلد نظر آتا ہے۔ لیکن اس نے اپنے مثالی نمونوں کی کبھی اندھی تقلید نہیں کی ہے۔ بظاہر اس کے اشعار اس کے زمانے اور ہم وطنوں کے مذاق کے عین مطابق تھے اور انھیں موجودہ زمانے تک بڑی مقبولیت حاصل رہی ہے۔ اس کی آخری تصنیف «محاکمۃ اللغتین» جو دسمبر ۱۴۹۹م (جمادی الاولی ۹۰۵ ھ) میں مکمل ہوئی تھی، اہم کتاب ہے۔ اس میں ترکوں اور ایرانیوں کی زبان اور ثقافت کا باہمی مقابلہ کیا گیا ہے اور مصنف نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ شعرگوئی کے لیے اور عام طور پر معنوی مقاصد کے لیے ترکی زبان فارسی سے کم موزوں نہیں ہے[2]۔

میرعلی شیر نوائی نظم و نثر دونوں میں ایک سی امتیازی شان رکھتا ہے۔ موسیو بیلین[3] نے اس کی کل تصانیف کی تعداد ۲۹ اور رکن‌الدین همایون فرخ[4] نے ۳۲ شمار کرائی ہیں[5]۔ لیکن ان کی بتائی ہوئی کتابیں

---

(۱) *The Babar nama*, ed. Annethe Beveridge (London, 1905), p. 40

(۲) *The Encyclopadia* of Islam Vol. IV, p. 916 ; اردو دائرۂ معارف اسلامیہ (لاهور، ۱۹۶۲م) ٤ : ۲۵۲

(۳) *Journal Asiatique*, Vol 17, p. 194

(٤) دیوان امیر نظام الدین علیشیر نوائی فانی (تهران ۱۳٤۲ شمسی) صفحه چهارده و پانزده.

(٥) راقم الحروف کو میرعلی شیرنوائی کی چند تصانیف کے ایسے قلمی نسخوں کا پتا چلا ہے جن کا ان حضرات نے ذکر نہیں کیا ہے۔

اب نایاب یا کمیاب ہوگئی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ بعض تذکروں اور مختلف بیاضوں میں میر علی شیرنوائی کے ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں جو اس کے مطبوعہ آثار سے خارج ہیں۔ اس مضمون میں ایسی ہی ایک قدیم قلمی بیاض سے جو ڈاکٹر نذیر احمد کے خیال کے مطابق ۹۶۳ اور ۹۸۰ کے درمیان مرتب ہوئی ہے، میرعلی شیر نوائی کا کچھ کلام مع اردو ترجمہ پیش کیا جارہا ہے۔

یہ بیاض علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری کے ذخیرۂ حبیب گنج میں محفوظ ہے اور اس کا نمبر ۵۰ / ۹۲ ہے۔ اس بیاض میں تقریباً ساڑھے تین سو شعراء کا کلام درج ہے جن میں ترک سلاطین، امرائے ہندستان اور ایران کے معاصر اور دوسرے بادشاہوں کے علاوہ وسط ایشیا کے بھی شعراء شامل ہیں۔

## ترکچہ شعرلری

۱ بیزنینگ ایہن یول اوزکا ساری قالمیش
بو ساری بیزنی دریا موجی سالمیش

۲ زلفونگ گرہیغہ پای بست اولمیش مین
لعلینگ می‌دین بادہ پرست اولمیش مین

۳ اول می‌نی ایچیب یولونگدا پست اولمیش مین
می‌ہی نی دیدم مگرکہ مست اولمیش مین

٤ کوب آتشگاہ اوتیدین تابمیشام داغ
کہ تاجمع ایلامیش مین بو قدر یاغ

۵ قایوسی و ادیکیم اشک سیلی سورمامیش
قایوسی تاغ اوجیغہ کیم موجی باشمہ اورمامیش

٦ استاما سانگ ایلاما سانگ بیزنی
میں اوپاورام یولونگ اوزرا ایزنی

۷ لعل لبینک که جانیم ایرور مبتلا انکا
مخلص دیمان که ایستارام اولغای فدا انکا

---

۸ زلف و قدینک فرقیدین نیچه قیلسام گشت باغ
اوکا آلمان چمن‌نینک سنبل و شمشاد بدین

---

۹ یوز محنت و غم کونکلومه یتکوردی فراق
جانیمغه بلا و درد اوقین اوردی فراق
۱۰ بیر گل غمیدین قویای دیدم باغریمه داغ
بیر کایمودییان عطری دماغیمغه فراق

---

۱۱ سر عشقینکنی دی آلمان یازاهم آلمان کیم
تیلی ایکی قلم و کونکلی قرا گیلدی دوات

---

۱۲ توروب معرض‌دا سوز حدیمنی بیلمان
جواب ایتورغه اوز حدیمنی بیلمان
۱۳ ولی گیلتورما کیکا چاره بیلمان
بوعجزیمدین ایشکا باره بیلمان

---

۱٤ ای صبا آواره کونکلم استایو هریان بارو
وادی و تاغ و بیابانلارنی بر بر آختارو
۱٥ آلداگیل گر بولسه مجنون شیوه و بی‌اختیار
قویماین اوز احتیاریغه بو ساری باشقارو

---

۱٦ مونکا تکرو که حالا ساغ ایمیش دوک
یری که دشت و کاهی تاغ ایمیش دوک

---

۱۷ دیدیلار سین چغتای ایلی سین
اوشبو بیردا چغتای خیلی [illegible]

۱۸ نیدیب اوزبک بیله یـاور بولدونک
خـاتغه بوینکایغ جاکر بولدونک
۱۹ . مین دیدیم سیزکه جوابیم اوق‌تور
بوندین اوزگا بسه سوزیم یوق تور

## اردو ترجمہ

۱ـــہمارے لیے امن و سلامتی کا راستہ دوسری طرف ہے . اس طرف تو ہمارے لیے دریا کی خطرناک موجیں ہی ہیں .

۲ـ۳ـــمیں تیری زلف گرہ‌گیر کا اسیر ہوگیاہوں . تیری شراب لب لعل کا مےخوار بن گیا ہوں . یہ شراب پی‌کر ہر کوچہ و بازار میں لڑکھڑاتا اور گرتـا پڑتا ہوں . ہائے ! یہ میں نے کیا کہہ‌دیا . شاید میں بہت زیادہ مست اور مدہوش ہوگیا ہوں .

٤ـــ(حسن کے) کتنے ہی آتش‌کدوں کی آگ سے میں جل‌کر زخمی ہوگیا . اسی لیے تو اس قدر مرحم میرے جسم پر جمع ہوگیا ہے .

۵ـــ(فراق میں روتے ہوئے کہتا ہے) اشکوں کا یہ سیلاب کس وادی سے چلا آرہا ہے کہ مجھے غرق کیے دیتا ہے . اب میں کس پہاڑ پر جاؤں کہ اس کی موجیں مجھے غرقاب نہ کردیں .

٦ـــتو مجھے نہیں چاہتا . میری طرف کوئی توجہ نہیں دیتـا ! میں تیری راہ کے نشان قدم پر پھر بھی اپنے بوسے نثار کرتا ہوں .

۷ـــمیرا دل تیرے لب لعل کا اسیر ہے اور اس دام سے رہائی نہیں چاہتا ، وہ تو خود اس کا والہ و شیدا ہے .

۸ـــتیرے زلف و قد کے ہمسر کی تلاش میں میں نے کتنے ہی چمنستان چھان ڈالے مگر کوئی ان جیسا نہ ملا . سنبل و شمشاد بھی میرے معیار پر پورے نہ اترے .

۹ـ۱۰ـــتیری فرقت میرے دل کے لیے لاتعداد رنج و الم کا باعث بنی . اس فراق نے میری زندگی پر درد و غم کے تیر برسائے ہیں . میں

پھر بھی یہی کہتا ہوں کہ یہ غم کا کوہِ گراں میرے لیے ایک گلاب کا
پھول ہے جس کی خوشبو سے میرا مشامِ جان معطر ہے ۔

۱۱۔عشق کے راز درون پردہ سے تمھیں کیسے مطلع کروں ۔ قلم
میری صحیح ترجمانی نہیں کرتا کیونکہ میں کچھ لکھنا چاہتا ہوں و
کچھ لکھتا ہے اور دوات کا بھی دل سیاہ ہے۔

۱۲۔۱۳۔تجھ سے آمنے سامنے بات کرنے کی ہمت اپنے میں نہیں
پاتا ہوں کیونکہ تیرے سوال کا جواب دیتے وقت میں عالم خود فراموشی
میں پہونچ جاتا ہوں۔ اس کا درماں بھی میرے پاس نہیں۔ اسی لیے میں گوشہ
نشین ہوگیا ہوں کہ کہیں تم سے گفتگو نہ ہوجائے ۔

۱۴۔۱۵۔اے بہار ! میرے آوارہ دل کی تلاش میں ہر طرف جا
وادی ، پہاڑ ، بیابان ہر جگہ اس کو تلاش کر ۔ وہ عشق میں مجنون بن گیا
ہے اور کہیں کھوگیا ہے ۔ اس کو اس کے حال پر نہ چھوڑ۔ اس کو
میرے پاس لے آ ۔

۱۶۔اس کی زندگی ریگستان کی طرح خشک و بے کیف اور پہاڑ
کی طرح دشوار گزار ہوگئی۔ پھر بھی وہ زندہ ہے۔

۱۷۔۱۹۔کہنے لگے کہ تم چغتائی ہو۔ اور چغتائی فوج سے تعلق
رکھتے ہو۔ پھر کہا کہ تم ازبکوں کے دوست ہوگئے ہو اور بادشاہ کے
خیرخواہ ہو۔ اس پر میں نے صرف یہ کہا کہ اس کے علاوہ تمہارے پاس
میرے لیے کوئی دوسرے الفاظ نہیں ہیں ۔

علی گڑھ ڈاکٹر اکمل ایوبی

* *

## مجلۂ علوم اسلامیہ

مرتبہ

ڈاکٹر مختار الدین احمد

| | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|
| جلد اول نمبر ۱ | ۱۹۶۰ | ۵ روپے | جلد سوم نمبر ۱ | ۱۹۶۲ | ۵ روپے |
| جلد اول نمبر ۲ | ۱۹۶۰ | ۵ روپے | جلد سوم نمبر ۲ | ۱۹۶۲ | ۵ روپے |
| جلد دوم نمبر ۱ | ۱۹۶۱ | ۵ روپے | جلد چهارم نمبر ۱ | ۱۹۶۳ | ۵ روپے |
| جلد دوم نمبر ۲ | ۱۹۶۱ | ۵ روپے | جلد چهارم نمبر ۲ | ۱۹۶۳ | ۵ روپے |

جلد پنجم نمبر ۱، ۲ ۱۹٦٤ ۱۰ روپے

## مطبوعات شعبۂ عربی و اسلامیات

البیان فی إعجاز القرآن للخطابی ۲ روپے

تحقیق و تحشیہ : ڈاکٹر عبد العلیم

وصف الهند و ما یجاورها من البلاد للإدریسی ٤ روپے

تحقیق و تحشیہ : ڈاکٹر مقبول احمد

ملنے کا پتا:

منیجر یونیورسٹی پبلیکیشنز ، ظهور وارڈ

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

# فہرست مطبوعات ادارۂ علوم اسلامیہ

## عربی

معرفة المذاهب — ۱ روپیا

تصحیح : ڈاکٹر عبدالعلیم

فضائل من اسمه أحمد أو محمد لابن بكير البغدادی — ۲ روپے

تصحیح و تحشیه : ڈاکٹر مختارالدین احمد

المختار من شعر ابن الدمینة إختیار الخالدیین — ۵ روپے

تصحیح و تحشیه : ڈاکٹر مختار الدین احمد

رسالة فی ضبط مواضع من الحماسة لأبی هلال العسكری — (زیر طبع)

تصحیح و تحشیه : ڈاکٹر مختارالدین احمد

## فارسی

برگزیدۂ شعر فارسی معاصر از ڈاکٹر منیب الرحمن (دو حصے) — ۲۰ روپے

جدید فارسی شاعری از ڈاکٹر منیب الرحمن (مجلد) — ۳ روپے

## اردو

ہندستان میں عربی ادب اور علوم اسلامیہ کی تدریس و تحقیق — ۱ روپیا

از ڈاکٹر عبدالعلیم

ترکی از ڈاکٹر اکمل ایوبی — ۷ روپے

عراق از ڈاکٹر محمود الحق — ۷ روپے

**Qasim b. Qutlubugha al-Hanafi by Mr. Fazlur Rahman:** The author has, in this second and concluding instalment of his monograph presente a comprehensive annotated bibliography of the works of Qasim b. Qutlubugha. The study of Qasim's writings reveals one of the most striking phenomenon of the history of fiqh—blending of the two different schools of Ahl al-Hadith and Ahl al-Rai—thus enabling us to understand the history of fiqh more clearly.

## SHORT NOTES AND COMMUNICATIONS

**Nawai ke Turki Ash'ar** (Turkish verses of Nawai) by Dr. N. Akmal Ayyubi : Mir 'Ali Shir Nawai (1440-1501) was one of the most famous Turkish poets of central Asia. The writer of the present note has collected his Turkish verses mainly based on an old manuscript (*Bayaz*) preserved in the Maulana Azad Library of Aligarh Muslim University. The note contains an Urdu translation of these verses and is preceded by a short introduction.

# MAJALLA-I 'ULŪM-I ISLĀMĪYA

Vol. 5 JUNE & DECEMBER 1964 Nos. 1, 2

## SYNOPSIS OF CONTENTS

### ARTICLES

**'Arabon ka 'Ilm-ul-Muthallathat** by Mr. Shabbir Ahmad Khan Ghori: The present writer published an article on the development of Trigonometry before Alberuni (*Majalla* June, 1961). Mr. Fazluddin Qureshy, Punjab University Lahore, disagreed on certain points raised therein (*Majalla* June 1963) which have been explained in the present article.

**Sadruddin 'Ali b. Abi'l-Faraj al-Basri**: by Dr. Mukhtar-ud-Din Ahmad: The Abbasid period in Arab History was most fruitful for the compilation of poetic collections. Several anthologies were prepared during this period apart from such collections as were made on the lines laid down by Abu Tammam (d. 850 A.D.). Among the most important *Hamasas* is the *Hamasat al Basriyya* by Sadr al-Din 'Ali b. Abi'l Faraj-al-Basri. Although complete obscurity surrounds the life of its author the work itself is fairly known and enjoys a widespread reputation. The article attempts to reconstruct the biography of the compiler with the help of scanty material available through historical and literary sources and to introduce *Hamasat-al-Basriyya* besides other *Hamasas* and anthologies of this kind which were prepared in the 7th century Hijra.

**Farisi men 'Ilm Badi' ki Tarikh-o-Tadvin.** (The development of the Science of Rhetoric in Persian) by Mr. Ashfaq Ali Khan: This article is in continuation of one pblished in the *Majalla* (December 1963). The present instalment attempts to give a critical analysis of the works of some of the Persian authorities on Rhetoric.

VOLUME 5 NUMBERS 1, 2

# MAJALLA-I 'ULŪM-I ISLĀMIYA

JUNE & DE[redacted]

*Published by*
THE INSTITUTE OF ISLAMIC STUDIES
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH, INDIA